تفسیر

سورۃ الاخلاص

مؤلف

جلال الدین القاسمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفسیر

سورۃ الاخلاص

مولف

جلال الدین القاسمی

فہرست سورۂ اخلاص

مضامین	صفحہ
انتساب	۳
تقریظ مولٰنا محمد ابن صاحب ریاضی	۴
تقریظ مولٰنا نیاز احمد حسرت علی	۶
پیش لفظ	۸
تمہید سورۂ اخلاص	۱۱
اخلاص فی العقیدہ	۱۲
اخلاص فی العمل	۱۳
شان نزول سورۂ اخلاص	۱۶
فضیلت سورۂ اخلاص	۱۸
قل کا مفہوم	۲۳
ھو کا مطلب	۲۴
تعقل اور تصور کی تفصیل	۲۶
اللہ	۲۷
اسماء وصفات	۳۳
احد اور واحد میں فرق	۳۴
لفظ احد سے ثنویت کا رد، تعدد فی الالوہیت	۳۶ - ۳۷
تفسیر الصمد، اشتقاق کی توضیح،	۴۰، ۴۱
الصمد سے الوہیت مسیح کا رد، ولادت کے معنیٰ	۴۳، ۴۶
حیوان متولد اور حیوان متوالد	۴۹
خروج کلام کی تصریح	۵۳
ابنیت اور مولودیت کا رد	۵۳
ولم یکن لہ کفواً، خدا کی تین بڑی صفتیں	۵۵، ۵۸
جسم باری تعالیٰ پر بحث	۶۳
انا و نحن کی بحث	۶۷
حلول و اتحاد اور تصور اوتار کا رد	۶۹
استواء علی عرش	۷۲
رویت باری	۷۸
توحید اور شرک	۸۰
قرآن معلم التوحید ہے، لیس کمثلہ شیئ	۸۱/۸۲
امکان کذب باری محال، معطلہ اور مشبہہ کا رد	۸۷/۹۱
وجود باری پر بحث، خلاصہ سورہ اخلاص	۹۳/۹۹

انتساب

حضرت علامہ ابن تیمیہ و حضرت علامہ محمد
ابن عبدالوہاب نجدی رحمہما اللہ جیسے ان تمام
غیور موحدین کے نام
جو توحید کے مقدس دامن پر شرک و
بدعت کی ذرہ برابر بھی آلودگی دیکھنا گوارہ
نہیں کرتے

نام کتاب ---- تفسیر سورۂ اخلاص
مولف ---- مولانا جلال الدین صاحب القاسمی
ناشر ---- مولانا جلال الدین صاحب القاسمی
کاتب ---- نیاز خان سلفی
صفحات ---- ۱۰۰/
اشاعت بارہ اول ایک ہزار اکتوبر سنہ ۱۹۹۴ء
قیمت ----

الحمد لولیہ والصلوٰۃ والسلام علی نبیہ

آج تفسیر سورۂ اخلاص کے مسودہ کا جستہ جستہ بغور مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا جو نوجوان حضرت مولینا جلال الدین قاسمی کے علمی وقلمی شاہکار کا بیش بہا خزانہ ہے۔
یوں تو بہتوں نے سورہ اخلاص کی تفسیریں کی ہیں مگر مولینا موصوف نے جس انوکھے و اچھوتے انداز میں آیات کے ہر ٹکڑے کی علمی وفکری تشریح کی ہے اسے پڑھکر مولینا موصوف کے وسعتِ مطالعہ محنت و لگن کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے جو جو صفات اس سورہ میں موجود ہیں اس کے معانی بیان کرنے میں جس جذب و مستی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ مولینا موصوف ہی کا حصّہ ہے مولینا کی نظر بڑی وسیع اور دقیق ہے۔ مولینا موصوف چار پانچ سال تک پابرہ رائے گڈھ علاقہ کوکن میں خطابت کے فرائض انجام دے چکے ہیں

مولینا کا خطبہ سننے کے لئے لوگ دور دور سے خیرانی روڈ اہلحدیث

مسجد میں آتے ہیں کیونکہ خطابت کا انداز ہی کچھ اور ہے جو دوسروں میں کم ہی مل پائیگا۔

قاسمی صاحب کی تصنیفی میدان میں غالبًا یہ پہلی کوشش ہے جسکی زبان نہایت سادہ عام فہم ہے ادب وانشاء کی چاشنی سے بھرپور ہے۔

مجھے امید ہے علماء طلباء عوام وخواص اس کتاب کو پڑھکر استفادہ کرکے مصنف کے حق میں ضرور دعائے خیر کریں گے میں تمام اہل علم سے اپیل کرتا ہوں کہ قاسمی صاحب کے منطقی استدلال اور جدید طرز تحقیق سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں

اللہ تعالےٰ اس کتاب (تفسیر سورۂ اخلاص) کے مصنف ومعاونین ومحسنین کے حسنات کو قبول فرمائے آمین۔

محمد امین ریاضی

امین عام صوبائی جمعیۃ اہلحدیث بمبئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامدًا ومصلیًا امابعد

زیرنظر کتاب "تفسیر سورۂ اخلاص" ہمارے فاضل دوست جناب مولانا جلال الدین القاسمی صاحب کی طرف سے میدان تفسیر میں ایک انوکھا قدم ہے۔ تبحر علمی ودقیقہ رسی، ودقیقہ سنجی کے لحاظ سے قارئین کے لئے انمول رتن ہے۔ باطل عقائد جیسے تثلیث ومسئلہ حلول اور مشرکین وکافرین کے خرمنِ ضلالت پر رعد وبرق ہے۔ عقل سلیم وذوق علمی نیز جملہ اولوالالباب کے لئے برہان ونور مبین ہے۔ تحریر میں زور ہے، انداز بے باکانہ ہے۔ نتائج منطقیانہ وفلسفیانہ ہیں مگر منہج علماء سلف سے ہٹ کر نہیں۔ تحریر فصاحت وبلاغت سے پُر، معانی وبدیع سے لبریز، تمثیلات وتشبیہات کی آئینہ دار ہے۔ یہ یہ تفسیر آپ کو یہ سوچنے پر مجبور کردے گی کہ یقینا بلاریب ومنون اللہ احد ہے۔ اللہ صمد ہے۔ نیز جب آپ

یہ کتاب بند کریں گے تو آپ کے دل پہ یہ نقش ہو چکا ہوگا
کہ لیس کمثلہ شیئ وھو السمیع البصیر"
جس طرح غواص سمندر کی گہرائیوں سے موتی حاصل
کرتا ہے بالکل اسی طرح آپ موصوف کے فکری بحر بیکراں
سے حرف اور حرف توحید کے موتی حاصل کریں گے ان شاء اللہ
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے موحد دوست کی
طرف سے پیش کی گئی اس سعی جمیل کو شرف قبولیت
بخشے۔ آمین۔

نیاز احمد حسرت علی گورکھپوری،
وکیل الجمعیۃ المحمدیہ وتوابعھا،
شارع جرواتلسی پور، غونڈہ

پیش لفظ

اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں اسی پر بس نہیں کیا کہ مجھے
رب مانو اور مجھے معبود مان کر اپنی جبین نیاز کے سارے
سجدے میرے آستاں کے لئے مخصوص کردو بلکہ کرّات
مرات عنوانات اور اسالیب بدل بدل کر مثالیں دے
دیکر یہ بھی فرمایا ہے کہ میں اپنی ذات اور صفات میں یکتا
ہوں، کائنات کی تمام مخلوق میری محتاج ہے اور ہر کوئی
میرے در کا بھکاری ہے، نیز مجھ جیسا کوئی نہیں، اور میری
خدائی میں کوئی شریک نہیں۔

اسی عقیدے کا نام توحید ہے یہی وہ محور ہے جس کے
اردگرد ایمان، اسلام، اخلاق کے تمام تقاضے گردش
کرتے ہیں۔ ایمان و اسلام کی بنیاد توحید ہی ہے اس
بنیاد میں اگر فرق آگیا اور یہ عقیدہ خدانخواستہ مجروح
ہوگیا تو پھر ایمان و اسلام، عبادات وتقویٰ سب کے
سب عنداللہ نامعتبر قرار پاتے ہیں۔

تمام انبیائے کرام کی بعثت کی غرض وغایت یہی تھی کہ انسانوں

کے سامنے اس عقیدہ کو پہلے پیش کریں چنانچہ یہ نفوس قدسیہ اپنی بعثت سے لیکر تا دم واپسیں توحید ہی کا درس دنیا کو دیتے رہے، توحید ہی ان کی دعوت و تبلیغ کا نقطۂ آغاز تھا، نقطۂ وسط بھی اور نقطۂ اختتام بھی ۔

دین میں توحید کی اسی اہمیت اور مقام و مرتبہ کی وجہ سے اللہ نے ایک مکمل سورہ، سورۂ اخلاص کے نام سے نازل فرمائی جس میں توحید خالص سے بحث کی گئی ہے اس سورہ کا انداز انتہائی سلیس، واضح، آسان اور عام فہم ہے ۔ اختصار کے ساتھ ساتھ کمال جامعیت موجود ہے اس مضمون کو علیحدہ ایک سورت میں انتہائی اختصار کے ساتھ ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے تاکہ معمولی ذہن رکھنے والے آدمی کے لئے بھی اسے حرز جان بنانے میں کوئی دشواری نہ ہو

اس سورہ کریمہ کی تفسیر متعدد علماء نے کی ہے اور ان میں سب سے عمدہ تفسیر ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی "تفسیر سورۃ الاخلاص" ہے درحقیقت حضرت نور اللہ مرقدہ کی یہ کتاب خزینۂ اسرار وحِکم اور گنجینۂ علوم و معارف ہے مگر چونکہ یہ کتاب عربی میں ہے اس لئے اس کے مضامین تک عوام کی رسائی نہیں ہوسکتی لہذا میں نے ضروری سمجھا کہ

ایسی ایک کتاب مرتب کروں جس میں اس سورہ کریمہ کے متعلق لکھی گئی بہت سی تفاسیر کے اہم اجزاء جمع ہوجائیں۔ اس کتاب کی ترتیب میں میں نے بہت محنت کی ہے ۔ علمی فرومائگی کے ساتھ ساتھ مراجع کی کمیابی کا احساس بھی برابر دامن گیر رہا ہے ۔

کتاب غلطیوں اور نقائص سے پاک ہے اس کا دعویٰ میں نہیں کرسکتا کیونکہ غلطیوں اور نقائص سے مبرا صرف اور صرف اللہ کی ذات پاک ہے

جلال الدین القاسمی

۲۲ ستمبر ۱۹۹۴ء مطابق ۱۵ ربیع الآخر ۱۴۱۵ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

ترجمہ: کہہ کہ وہ اللہ احد[1] ہے۔ اللہ صمد[2] ہے۔ نہ وہ والد (باپ) ہے۔ نہ وہ مولود (بیٹا) ہے نہ کوئی اس کی برابری کا۔"

منظوم ترجمہ: تم کہدو اے محمد میرا خدا ہے یکتا
ہے بے نیاز سب سے بیٹی نہ اس کا بیٹا
ماں باپ بھی نہ اس کے ہمسر نہ کوئی اسکا

جس طرح سے ہر ایک کام کی ایک غرض اور انتہا ہوتی ہے جس پر وہ کام ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایمان کی انتہا محبت الٰہی ہے جیساکہ ارشاد ربانی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ "اور جو مومن ہیں اللہ سے ان کی قوی محبت ہے۔ تمام انبیاء کی تعلیم کا لب لباب ہی

---

[1] احد:۔ یکتا[1]، سب[2] سے نرالا[3]، بے[3] ہمہ

[2] صمد:۔ سب[1] اس کے محتاج، وہ کسی کا محتاج نہیں، باہمہ[2]، سب کا[3] ملجا و ماوی

تھا۔ اور جس طرح ایمان کی غایت محبت الٰہی ہے۔ اسی طرح محبت کی جان اخلاص ہے۔ تمام طاعات و عبادات بغیر اخلاص عنداللہ نامعتبر ہیں۔ حتیٰ کہ ایمان و عقیدہ میں اگر اخلاص نہ ہو تو نفاق بن جاتا ہے۔ اور عمل میں اگر اخلاص نہ ہو تو ریا بن جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے ؂

اخلاص سے نا آشنا ہر چیز ہے فتنہ
للّٰہ نہ کی جائے تو تکفیر ہے۔ فتنہ

اخلاص فی العقیدہ

اخلاص کا معنیٰ:۔ متولی الشعراوی اپنی مشہور کتاب "عقیدۃ المسلم"، میں لکھتے ہیں: الاخلاص انہ کانت ھناک امور مشتبکۃ، وانت تخلص بعضھا من بعضٍ یعنی بہت سی چیزیں آپس میں الجھی ہوئی ہیں اور آپ ان میں سے بعض چیز کو نکالکر الگ کرلیں۔ آپ کے اس الگ کرنے کے عمل کو اخلاص کہینگے۔

اخلاص کے اس مفہوم کی روشنی میں دیکھئے کہ لوگوں نے اپنی جہالت اور کج فکری کی وجہ سے حقیقی الٰہ واحد کے علاوہ اور بہت سے باطل الٰہ گھڑ لئے جس سے الوہیت کے مسئلے میں اشتراک

ہوگیا - اب اگر حقیقی الٰہ کو باطل الٰہہ سے الگ کر لیا جائے تو اس کو اخلاص فی العقیدہ کہیں گے۔

عمل میں حقیقی اخلاص

معلوم ہونا چاہیئے کہ شیء میں ملاوٹ کا شائبہ ہو سکتا ہے۔ جب ملاوٹ سے پاک وصاف ہو تو کہتے ہیں خالص ہے اور اس فعل کو اخلاص کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَۃً ط	اور تمہارے لئے مویشیوں میں غور
نُسْقِیْکُمْ مِمَّا فِیْ بُطُوْنِہٖ	درکار ہے۔ ان کے پیٹ میں جو گوبر
مِنْ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا	اور خون ہے ان کے درمیان میں سے
خَالِصًا سَائِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ	خالص اور خوشگوار دودھ ہم تم کو پینے کے لئے دیتے ہیں"

اسی طرح جب عمل ریا سے خالص ہو جائے تو اللہ کے لئے ہو جاتا ہے۔ ابو عبداللہ الباجی الزاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عمل کے پورا ہونے کے لئے پانچ خصلتوں کا ہونا ضروری ہے (۱) اللہ کی معرفت پر یقین (۲) معرفت حق (۳) عمل سنت کے مطابق کرنا۔ (۴) حلال روزی کھانا۔

ان میں سے ایک بھی کم ہو جائے تو عمل پورا نہیں ہوگا

مثلاً۔ آپ نے اللہ کی معرفت حاصل کر لی۔ مگر حق کی معرفت حاصل نہیں کی۔ اس سے آپ کو نفع نہیں پہنچ سکتا۔ اور اگر آپ نے حق کی معرفت حاصل کر لی مگر اللہ کی معرفت حاصل نہیں کی۔ اس سے آپ کو کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ اور اگر آپ نے اللہ کی معرفت حاصل کر لی۔ اور حق کی بھی معرفت حاصل کر لی مگر عمل میں اخلاص پیدا نہیں کیا تو اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ اور اگر آپ نے معرفتِ خداوندی اور معرفت حق کے ساتھ ساتھ عمل میں اخلاص بھی پیدا کر لیا۔ لیکن عمل سنت کے مطابق نہیں کیا تو اس عمل سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ اور اگر چاروں مذکورہ باتیں آپ نے پوری کریں مگر آپ نے حلال روزی نہیں کھائی تو اس سے بھی آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

فضیل رح نے اللہ تعالیٰ کے اس قول لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا میں اَحْسَنُ عَمَلًا کی تفسیر اَخْلَصُ عَمَلًا وَّ اَصْوَبُ عَمَلًا سے کی ہے۔ یعنی عمل کی صحت اور اس کے مقبول عند اللہ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خالص کے ساتھ ساتھ صواب بھی ہو۔ فرماتے ہیں خالص وہ ہے جو فقط اللہ کی رضا جوئی کیلئے ہو، اور صواب وہ ہے جو سنت کے مطابق ہو۔ حضرت ابو امامہ باہلی رض سے روایت ہے کہ ایک آدمی اللہ کے رسول صلی

اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول بھلا بتلائیے کہ ایک آدمی مال اور شہرت کی خاطر لڑنے گیا تو اس کے لئے کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کچھ نہیں، اس نے تین مرتبہ پوچھا ہر بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا "کچھ نہیں" پھر فرمایا کہ اللہ صرف ایسی عمل کو شرف قبولیت سے نوازتا ہے جو اسی کے لئے خالص ہو اور جس عمل سے اس کی رضا جوئی مقصود ہو۔ (خرج نسائی باسنادٍ جید)

یہ حقیقت تو اب روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ دین میں اخلاص کس قدر ضروری ہے یہاں کسی باطل کی ذرا بھی آمیزش سم قاتل سے زیادہ خطرناک ہے اب اس خاص مسئلہ محبت الٰہی کو دیکھو اس میں سب سے زیادہ اخلاص کی ضرورت ہے۔ محبت الٰہی میں اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی محبت کے علاوہ بہت سی دوسری چیزوں کی محبت دل میں ہونا قدرتی بات ہے۔ مثلاً والدین، بیوی بچے، اعزہ و اقارب مال و دولت، جاہ وحشمت سب چیزوں سے انسان محبت کرتا ہے۔ لیکن جو چیز مطلوب ہے۔ وہ یہ کہ ان تمام چیزوں کی محبت اللہ کی محبت پر غالب نہ آنے پائے کہ اللہ کی فرماں برداری اور اطاعت کے راستے میں رکاوٹ بن جائے۔ اللہ کا ارشاد ہے

اُذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ تم اللہ کو اس طرح یاد کرو جیسے آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھکر یاد کرو"

دیکھو اس آیت میں محبت الٰہی کو ادا کرنا تھا تو یہ نہیں کہا کہ تم اپنے باپوں کو یاد نہ کرو۔ یہاں اللہ نے اپنی محبت اور باپ کی محبت کو باہم مشبہ اور مشبہ بہ قرار دیا اس سے ظاہر یہ ہوا کہ باپوں سے بھی محبت رکھو مگر اللہ کے مقابلہ میں اس محبت کو بالکل کم تر اور ہیچ سمجھو۔

سورۂ اخلاص کا شانِ نزول

ابو جعفر رازی نے یہ حدیث ربیع بن انسؓ اور انہوں نے ابی بن کعب سے روایت کی ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہمیں اپنے رب کا نسب نامہ بتائیے اس پر اللہ نے قل ھُوَ اللہ احد ۝ اللہُ الصمد ۝ کی سورۂ مبارکہ نازل فرمائی۔

عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب نامہ ہمیں بتائیے۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ (طبرانی)

عکرمہ نے ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ یہودیوں کا

ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور انہوں نے کہا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں بتائیے کہ آپ کا وہ رب کیسا ہے جس نے آپ کو بھیجا ہے۔ اس پر بھی اللہ نے یہ سورت نازل فرمائی

(ابن ابی حاتم، ابن عدی بیہقی فی الاسماء والصفات)

ضحاک اور قتادہ اور مقاتل کا بیان ہے کہ یہودیوں کے کچھ علماء حضورؐ کے پاس آئے اور کہا اے محمدؐ ہمیں اپنے رب کی کیفیت بتائیے۔ شاید ہم آپ پر ایمان لے آئیں۔ اللہ نے اپنی صفت توراۃ میں نازل کیا ہے۔ آپ بتائیے کہ وہ کس چیز کا بنا ہے؟ کس جنس سے ہے؟ سونے کا بنا ہے یا تانبے سے یا پیتل سے یا لوہے سے، یا چاندی سے، اور وہ کیا کھاتا پیتا ہے۔ اور کس سے اس نے کائنات کی میراث حاصل کی ہے؟ اور اس کے بعد کون اس کا وارث ہوگا؟ اس پر بھی اللہ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ (تفسیر سورۂ اخلاص ابن تیمیہ)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مواقع پر مختلف لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معبود کی ماہیت اور

کیفیت دریافت کی تھی، جس کی عبادت کی طرف آپ لوگوں کو دعوت دے رہے تھے۔ اور ہر موقع پر آپ نے اللہ کے حکم سے یہی سورہ سنائی۔ سب سے پہلے آپؐ سے یہ سوال مشرکین مکہ نے کیا تھا اس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔ اس کے بعد مدینہ طیبہ میں کبھی یہودیوں نے کبھی عیسائیوں نے اسی طرح کے سوالات کیے۔ پس صحیح بات یہی ہے کہ یہ سورہ مکی ہے اور یہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔

فضیلت سورۂ اخلاص

بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی میں ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا کہ یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ مفسرین نے اس ارشاد کی مختلف توجیہات کی ہیں مگر سیدھی اور صاف توجیہ یہ ہے کہ قرآن جس دین کو پیش کرتا ہے اس کی بنیاد توحید رسالت اور آخرت پر ہے، یہ سورت چونکہ خالص توحید بیان کرتی ہے۔ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک تہائی قرآن کے برابر قرار دیا۔ یہ سورہ اگرچہ قرآن حکیم کی ایک مختصر سورہ ہے مگر علوم و معارف کا گنجینہ ہے۔ اس کے ہر ہر لفظ کی گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو ہر طرف اسرار و معانی کا سمندر

ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک طرف یہ سورہ دین اسلام
کی روح و مغز یعنی توحید کا محکم انداز میں اثبات کرتی ہے۔
تو دوسری طرف دنیا کے تمام عقائد باطلہ اور فرق ضالہ کا رد
سلجھے ہوئے انداز میں کرتی ہے۔ اس سورۂ کریمہ کی
معجز نمائی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسی ایک سورہ
نے ایک جرمن مفکرہ مسٹر رابرٹ برنٹ کے دل کی دنیا بدل دی
اور انہوں نے اپنے آبائی مذہب کو ترک کر کے اسلام قبول کر لیا
اپنے اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں جو تفصیلات مسٹر رابرٹ
برنٹ نے بیان کی وہ یہ ہیں۔ میں ایک جرمن نومسلم ہوں جب
جب میری عمر دس سال کی ہوئی، تو جرمن پروٹسٹنٹ فرقے
کی روایات کے مطابق مجھے کلیسا میں داخل کر دیا گیا۔ پادری
نے جب مجھے مقدس تثلیث کا مطلب سمجھایا تو میں حیران رہ گیا۔
انہوں نے بتایا کہ خدا اس کا بیٹا حضرت عیسیٰ اور روح القدس
بظاہر علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر در اصل یہ ایک ہی
چیز کی تین صورتیں ہیں یہ بات میرے حلق سے نہیں اتری کیونکہ علم
ہندسہ کا معمولی طالب علم بھی یہ بات سمجھتا ہے کہ ایک ایک ہے
اور تین تین، آپ ہزار کوشش کریں مگر ایک کو تین اور تین
کو ایک ثابت نہیں کر سکتے۔ دل نے وہیں کہہ دیا کہ یہ عقیدہ الہامی

نہیں ہو سکتا۔ بلکہ من گھڑت عقیدہ ہے پھر پادری نے
ایک دن یہ بتایا کہ عیسیٰ کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔ اور یہ قربانی
انہوں نے اس لئے دی تھی تاکہ ان کے پیروؤں کے اگلے پچھلے
گناہوں کا کفارہ ہو جائے، یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں
آئی۔ کیونکہ میں ایسے خدا کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ جس نے
عیسائیوں کی نجات کا ایسا سستا اور عجیب و غریب راستہ
بتایا ہو کہ ایک پیغمبر کے سولی پر چڑھ جانے سے اس کی پوری
امت کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور پوری امت کو ہر قسم
کے گناہ کرنے کی کامل آزادی مل جائے۔ پھر یہ بات تو کسی
طرح بھی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اللہ بزرگ و برتر ہوتے ہوئے
اپنی مخلوق ہی میں سے کسی کو اپنا بیٹا بنا لے بلکہ اسے دنیاوی
جھگڑوں سے بلند ہونا چاہئے۔ انہیں اسباب کی بنا پر میرا
دل کلیسا اور پادریوں کی تعلیم سے متنفر ہو گیا۔ اسکے
بعد میں نے حقیقت کی تلاش کی غرض سے توریت کا مطالعہ
شروع کیا اسے ختم کرنے کے بعد بدھ مت پر لکھی گئی ہر
دستیاب کتاب پڑھ ڈالی۔ اسلامی کتابوں کا مطالعہ اس
لئے میں نے نہیں کیا کیونکہ اسلام کے خلاف پادریوں کی
زہرافشانی کی وجہ سے میں بچپن ہی سے اس مذہب کو

قابل اعتناء نہیں سمجھتا تھا۔ میری سب سے بڑی تمنا یہ
تھی کہ میں کائنات کے خالق اور تخلیق کائنات کی حقیقت
سمجھ لوں۔ میں یہ معلوم کر لوں کہ زمین پر انسان کی زندگی
کا مقصد کیا ہے؟ میں تلاش حق میں کتابوں کا کیڑا بن گیا۔
بڑے بڑے مصنفین و مفکرین کی کتابیں پڑھتا رہا اس حالت
میں پورے چودہ سال گزر گئے اور تلاش حق اور تلاش حقیقت کی
دھن آگ کی طرح میرے سینے میں سلگتی رہی۔

عجیب بات ہے کہ جب میں نے حوصلہ چھوڑ دیا اور فیصلہ کر لیا
کہ میں خواہ لاکھ کوشش کروں حقیقت کا سراغ مجھے نہیں
مل سکتا۔ اسی وقت اللہ نے مجھ پر اپنا خاص فضل و کرم کیا
شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کو میرے تھک ہار کر بیٹھ جانے
پر ترس آ گیا اس نے صراط مستقیم کی طرف میری رہنمائی اس
طرح کی کہ اتفاق سے ایک ایسے جرمن جہاز راں سے میری ملاقات
ہو گئی جسے مشرق کے تمام ممالک کے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور لطف
کی بات یہ کہ وہ خود بھی مسلمان نہیں تھا۔ بلکہ وہ ایک
عیسائی تھا۔ مگر مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کے عقائد اور ان کے
طرز تمدن سے متاثر تھا اسلام کے بارے میں اپنی معلومات
اسکّہ میرے اوپر بٹھانے کے لئے اس نے سورۂ اخلاص کا

متن اور ترجمہ مجھے دکھایا جب میں نے اس ترجمہ کو پڑھا تو دنگ
رہ گیا وہی چیز جو میں ساری عمر تلاش کرتا رہا تھا قرآن
کی اس چھوٹی سی سورہ میں موجود تھی۔ چودہ سال سے جس
راہ کی تلاش میں بھٹک رہا تھا وہ مل گئی۔ پھر میں
نے اسلام کا کافی مطالعہ کیا۔ اس کے بعد قاہرہ چلا گیا۔ تاکہ
وہاں مسلمانوں کے درمیان اسلام کا مطالعہ کروں۔ جب میں
جامعہ ازہر سے نکلا تو دوسرا انسان تھا

——— اب

تبلیغ اسلام میری زندگی کا مقصد اولین ہے۔

بخاری کتاب التوحید میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و
سلم نے ایک چھوٹا سا لشکر کہیں بھیجا جب وہ پلٹے تو انہوں
نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ نے جس شخص کو
ہمارا کمانڈر اور سردار بنایا تھا وہ ہر نماز کی قرائت کے خاتمہ پر
قل ھو اللہ احد کی سورہ پڑھا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا جاؤ ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے، پوچھنے پر
انہوں نے کہا کہ یہ رحمٰن کی صفت ہے۔ مجھے اس کا پڑھنا بہت
پسند ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انہیں خبر کر دو
کہ خدا بھی ان سے محبت رکھتا ہے۔ بخاری کتاب الصلوٰۃ میں

ایک روایت اسی قسم کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک انصاری
مسجد قبا کے امام تھے۔ ان کی عادت یہ تھی کہ الحمد للہ ختم کرتے
کے بعد اس سورہ اخلاص کو پڑھتے اس کے بعد پھر جونسی سورہ
پڑھنی ہوتی وہ پڑھتے تھے۔ مقتدیوں نے پوچھا تو کہا اسی طرح
میں کرتا رہوں گا، چاہے مجھے امام رکھو یا نہ رکھو۔ لوگوں نے یہ
واقعہ نبی کریمؐ سے بیان کیا تو آپؐ نے امام سے کہا کہ تم ایسا کیوں
کرتے ہو۔ کہنے لگے یا رسول اللہ مجھے اس سورہ سے بڑی محبت
ہے آپؐ نے فرمایا اس کی محبت نے تمہیں جنت میں پہنچا دیا۔
حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ
علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کھاتے وقت بسم اللہ بھول جائے۔
(اور کھانا کھاتے وقت یاد نہ آئے) تو جب بھی یاد آئے) اسے
قل ھو اللہ پڑھ لینا چاہیئے (رواہ ابن السنی)

قُل کا مفہوم

قُل کے معنیٰ ہیں "کہہ تو" یہ قَالَ یقولُ سے امر ہے جس کے
معنیٰ ہیں "کہنا" مگر اس کا وہی مطلب ہے جو قل یاایہا
الکفرون میں ہے۔ یعنی اعلان کر دو۔ منادی کر دو۔ برملا کہدو
کیونکہ سورۂ کافرون کا مضمون اعلان ہی کا تقاضہ کر رہا تھا۔
تاکہ مفسدین اور ائمہ کفر جو کفر اور اسلام کے درمیان سمجھوتے کے

خبط میں مبتلا تھے وہ اپنی سعیٔ نامراد سے مایوس ہو جائیں اور
سیدھے سادے قسم کے لوگ جو اس طرح کے سمجھوتے کو امن پسندی
سمجھ رہے تھے۔ انہیں معلوم ہو جائے کہ یہ امن پسندی اور صلح و
آشتی کا راستہ نہیں بلکہ فساد اور کجی کی مستقل نشو و نما کا راستہ
ہے۔ اس طرح کے اعلان کی ضرورت وہاں پڑتی ہے جب مباحثے
اور مناظرے کا پورا دور گذر چکا ہوتا ہے۔ اور یہ بات واضح ہو جاتی
ہے کہ سمجھانے کا حق ادا ہو چکا ہے۔ اب جو لوگ مزید بحثیں اٹھا
رہے ہیں وہ سمجھنے کے لئے نہیں بلکہ بات کو الجھانے اور طول
دینے کے لئے اٹھا رہے ہیں۔ اس طرح کے موقع پر مناسب یہ ہوتا
ہے کہ بات دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں اس طرح کہدی جائے
کہ مخاطب اندازہ کر لے کہ متکلم کو جو کچھ کہنا تھا کہدیا۔ اب وہ
اپنا وقت مزید ضائع کرنے کے لئے نہ تیار ہے اور نہ اس کے موقف
میں ذرہ برابر کسی تبدیلی اور لچک کی گنجائش ہے۔

(ماخوذ از تدبر القرآن)

ھُوَ کا مطلب

ھُوَ کا معنیٰ ہے "وہ" یہ ضمیر شان ہے جس کا مرجع متعین
ہوتا ہے۔ جب مطلقاً ھُوَ بولا جائے گا تو اس سے وہی مراد ہوگا،
جس کی شان ہر چیز سے ہویدا ہے۔ وہ: کون وہ؟ اور ے

وہی جسکا پتہ کائنات کی ہر شئے کو معلوم ہے۔ دریاؤں کی روانی سے پوچھ لو۔ سمندروں کی طغیانی سے پوچھ لو۔ آسمانوں کی بلندی سے پوچھ لو۔ یا زمین کی پستی سے پوچھ لو، پہاڑوں کے جلال سے پوچھ لو۔ درختوں کے جمال سے پوچھ لو۔ دن کی روشنی سے پوچھ لو، رات کی تاریکی سے پوچھ لو۔ سورج کی کرنوں سے پوچھ لو۔ کواکب کی چشمک سے پوچھ لو۔ عصافیر کی چہک سے پوچھ لو۔ سبزے کی لہک سے پوچھ لو۔ کلیوں کی چٹک سے پوچھ لو۔ پھولوں کی مہک سے پوچھ لو۔ ابر کے دھمک سے پوچھ لو، زندگی کی ٹھمک سے پوچھ لو۔ لہروں کی لچک سے پوچھ لو۔ غنچوں کے تبسم سے پوچھ لو۔ عنادل کے معصوم شور سے پوچھ لو۔ کرنوں کی جگمگاہٹ سے پوچھ لو۔ حسین صبح کی انگڑائیوں سے پوچھ لو۔ پتوں کی سرسراہٹ سے پوچھ لو۔ گلشن و خیاباں سے پوچھ لو۔ کہسار و بیابان سے پوچھ لو۔ صحرا کے سناٹے سے پوچھ لو آبادی کے ہنگامے سے پوچھ لو۔

کل الی ذالک الجمال یشیر

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ط

لفظ ھُوَ سے اس سورہ میں منکر وجود باری کا ابطال کیا گیا

ہے کیونکہ یہ لفظ ذات پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی وہ ہستی جسے قرآن اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔ فی الحقیقت موجود ہے اس کا وجود مستقل اور حقیقی ہے، وہمی یا خیالی نہیں ہے۔

متولی الشعرانی نے اپنی کتاب "عقیدۃ المسلم" میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن نے اللہ کے وجود پہ دلیل نہیں پیش کی ہے۔ کیونکہ دلیل کی وہاں ضرورت ہوتی ہے جہاں مسئلہ نظری ہو۔ لیکن اللہ کے وجود کا معاملہ بدیہی فطری اور وجدانی ہے فلاسفہ اور مفکرین جنہوں نے اللہ کے وجود پر دلیلیں وضع کی ہیں۔ انہوں نے تعقل اور تصور کو خلط ملط کر دیا انہوں نے تعقل کو تصور بنا دیا اور تصور کو تعقل بنا دیا

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

تعقل اور تصور کی تفصیل

تعقل یہ ہے کہ عقل حکم لگائے کہ اس کائنات کے پیچھے کوئی قوت ہے۔ مثلاً چند آدمی ایک کمرے میں بیٹھے ہیں اور دروازہ بند ہے۔ اچانک دروازہ کی گھنٹی بجائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کمرے کے تمام آدمی دروازے کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور کسی کو یہ

انکار کرنے کی مجال نہیں کہ دروازے پر کوئی موجود نہیں بلکہ سب کو یقین ہے کہ دروازے پر کوئی موجود ہے یہ تعقل ہے۔

اب ان میں یہ بات ہونے لگتی ہے کہ دروازے پر کون ہے؟ کوئی کہتا ہے مرد ہے۔ کوئی کہتا ہے عورت۔ کوئی کہتا ہے چھوٹا ہے۔ کوئی کہتا ہے بڑا ہے۔ کوئی کہتا ہے گندم گوں ہے تو کوئی کہتا ہے کالا ہے کوئی کہتا ہے گورا ہے۔ کوئی کہتا ہے بشیر ہے کوئی کہتا ہے نذیر ہے۔ یہ اختلاف ظاہر ہے کہ تصور میں ہے نہ کہ تعقل میں

اللہ

یوں تو اللہ تعالے کے بہت سارے نام ہیں۔ لیکن ان میں لفظ جلالۃ اللہ اسم ذات ہے اور باقی اسماء صفات ہیں یہ نام اس وقت بھی تھا جب کائنات میں کچھ نہ تھا اور اس وقت بھی ہوگا جب کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ یہ نام کائنات کی روح اور جان ہے یہ دنیا اس وقت تک قائم رہے گی جبتک کسی ایک زبان پر بھی یہ مقدس نام جاری رہے گا اور اگر کوئی ایک زبان بھی "اللہ"، "اللہ"، کہنے والی باقی نہ رہی تو بساطِ عالم کو لپیٹ دیا جائیگا آسمان کی قندیلیں بجھادی جائیں گی، زندگی کے دل لبھانیوالے سارے نظارے ختم کردیے جائیں گے۔۔ یہ نام ایسا مبارک اور بامعنیٰ

ہے کہ اگر اس میں کوئی گرا بھی دیا جائے تو بھی اس کا معنوی حسن برقرار رہتا ہے۔ مثلاً شروع سے الف گرا دیا جائے تو لِلّٰہ رہ جائے گا۔ یعنی اللہ کے لئے۔ قرآن میں ہے: لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ اور اگر لام گرادیں تو "الہ"، رہ جائے گا قرآن میں ہے وَاِلٰـھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ اور اگر الف لام دونوں کو حذف کردیں تو لَہٗ رہ جائے گا جس کا معنیٰ ہے "اس کے لئے" اور اگر لام کو بھی حذف کردیں تو "ہٗ"، "ھو"، رہ جائے گا جس کا متعین مرجع اللہ کی ذات کے سوا کیا ہوسکتا ہے؟

پورے قرآن میں اسم جلالت اللہ تقریباً دو ہزار نو سو چالیس مرتبہ آیا ہے نزول قرآن سے قبل عربی زبان میں خالق کائنات کے لئے جو لفظ مستعمل تھا وہ اللہ تھا جسے لفظ الہ پر الف لام تعریف کا داخل کرکے "اللہ"، اسم علم بنا لیا گیا تھا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے مشہور رسالہ "العبودیہ"، میں الہ کا مفہوم یہ بتایا ہے۔

الٰہ وہ ہے جس کی طرف دل کا میلان کمال محبت اور نہایت تعظیم و احترام و اکرام خوف و رجا اور اس طرح کی دیگر کیفیات کے ساتھ ہو، (لسان العرب ج ۱۷ صفحہ ۳۶ میں ہے)

وَلَا یَکُوْنُ اِلٰہٌ حتی یکون معبودًا وحتی یکون لعابدہ

خالقاً ورازقاً ومدبراً وعلیہ مقتدراً فمن لم یکن کذالک فلیس باللہ وان عبد ظلماً بل ھو مخلوق ومتعبد - کسی ہستی کو صرف اس وقت اللہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ معبود ہے اور معبود ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عابد کا خالق ہو۔ رازق و مدبر ہو اور ساتھ ہی اس پر تصرف کا اختیار بھی رکھتا ہو جو ایسا نہ ہو وہ الہ کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا خواہ وہ ظلم وجبر سے پوجا ہی جائے۔ وہ ہر حال میں مخلوق و مطیع ہی ہوگا

لسان العرب کے اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ الٰہ ہی معبود ہو سکتا ہے۔ معبود یہ ماخوذ ہے عبادت سے جس کا مطلب ہے کسی کے سامنے اپنے اختیار سے انتہا درجہ کی عاجزی وانکساری سے پیش آنا اور یہ حالت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جبتک کہ اس ہستی کی انتہا درجہ کی عظمت وجلالت اور تقدس کا قائل نہ ہو جائے۔ عابد کو دو ہی چیزیں عبادت پر مجبور کرتی ہیں

۱۔ کمال عظمت ۲۔ کمال محبت ۔ اب یہ امر وضاحت طلب ہے کہ کمال عظمت ومحبت کس چیز سے پیدا ہوتی ہے؟ تو واضح رہے کہ یہ عقیدہ دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے ۔ ۱۔ علم کامل مافوق الاسباب۔ ۲۔ قدرت کامل مافوق الاسباب ۔ ہمارا علم

ماتحت الاسباب ہے۔ کیونکہ ہمارا علم سننے کا چھونے کا چکھنے سونگھنے کا محتاج ہے اس لئے علم ناقص ہے کامل نہیں۔ اسی طرح ہماری قدرت بھی ماتحت الاسباب ہے۔ مثلاً اگر ہاتھ نہ ہوں تو کام نہیں کر سکتے۔ دماغ درست نہ ہو تو کام درست نہیں کر سکتے پاؤں نہ ہوں تو چل پھر نہیں سکتے۔

مگر اللہ کا علم کامل مافوق الاسباب اور اس کی قدرت کامل مافوق الاسباب ہے جب بندہ اللہ کو پکارتا ہے تو اس کے اعتقاد میں یہ ہوتا ہے کہ میں جس ذات کو پکار رہا ہوں اسے میرے دکھ درد کا علم ہے اور اسے یہ بھی علم ہے کہ مجھے فلاں جگہ سے فلاں بندہ پکار رہا ہے یہ علم کامل ہے۔

دوسری چیز بندہ کے اعتقاد میں یہ ہوتی ہے کہ میں جس ذات کو پکار رہا ہوں اسے قدرت وطاقت ہے کہ بغیر کسی سبب کے میری مشکلات آسان کر دے۔ جس وقت اور جہاں سے پکاروں ہر وقت ہر جگہ مدد کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی انسان کے متعلق یہ دو عقیدے کبھی بھی پیدا نہیں ہوئے۔ اگر کوئی اپنے والد کو جو دوسرے شہر میں ہے۔ یہاں ہندوستان میں بیٹھ کر چلا چلا کر اپنی پریشانی میں پکارے تو لوگ یہی کہینگے کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اسی طرح تکلیف میں بظاہر

شفا کرنے پر ڈاکٹر کو بھی قدرت ہے۔ لیکن آج تک ڈاکٹر کو کسی نے خدا نہیں سمجھا، اس کا کام ہے انجکشن لگانا اور دوا دینا آگے شفا دینا اللہ کا کام ہے یہ بڑا عجیب وغریب نکتہ ہے کہ قرآن میں جہاں بھی الٰہ کا ذکر آیا ہے وہاں دو چیزیں ۱- علم کامل ۲- قدرت کامل ضرور ہیں۔ قرآن میں ہے:

أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ ترجمہ "بھلا کون ہے جو بیقرار کی پکار سنتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے جب وہ بیقرار اس کو پکارتا ہے اور کون ہے جو تم کو زمین میں تصرف کا حقدار بناتا ہے۔ کیا کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے؟ تم لوگ بہت کم غور کرتے ہو۔"

اس آیت میں وہی دو صفات ہیں، مضطر کی پکار کو سننا علم کامل، اور اس کی پکار سنکر دکھ دور کرنا قدرت کامل، پھر اس کے ساتھ ہی کہا گیا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ ہے جو ایسا کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَجَعَلَ خِلَالَهَا أَنْهَارًا وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۗ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

بھلا کس نے زمین کو قرار گاہ بنایا اور اس زمین کے درمیان ندیاں بنائیں اور زمین کے لئے بھاری بھاری پہاڑ بنائے اور دو دریاؤں کے درمیان روک اور آڑ بنادی۔ کیا اللہ کے سوا اور الٰہ ہے بلکہ ان میں سے اکثر اس بات کو جانتے ہی نہیں۔

یہاں زمین کو قرار گاہ بنانا، اس میں نہریں چلانا، پھر دریاؤں اور سمندروں میں کرشمے دیکھیں کہ ایک ہی دریا ہے مگر ایک طرف میٹھا پانی بہتا ہے اور دوسری طرف کڑوا۔ لیکن اللہ نے دونوں کے درمیان ایک غیر مرئی آڑ رکھی ہے جو دو پانیوں کو آپس میں ملنے نہیں دیتا۔ بنگلادیش میں ایک دریا ہے ایک طرف میٹھا پانی، دوسری طرف کڑوا ہے۔ لیکن آپس میں ملتے نہیں۔ دریائے چناب کا پانی مٹیالے رنگ کا ہے۔ اور دریائے سندھ کا پانی صاف وشفاف ہے ملنے کے باوجود دونوں دریاؤں کا پانی جدا جدا نظر آتا ہے۔ سمندر میں دیکھیں عدن کے قریب ایک طرف ٹھنڈا پانی ہے دوسری طرف گرم پانی ہے۔ یہ قدرت کامل ہے۔ یہاں بھی آخر میں یہی کہا گیا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ ہے جو ایسا کر سکے۔

اسماء وصفات

اللہ کی صفات کو ہم اسماء بھی کہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ صفت اسم کب بن جاتی ہے۔ تو جاننا چاہیئے کہ جب صفت کمال کی اس انتہا کو پہنچ جائے کہ صفت بولے جانے پر اللہ ہی تبادر الی الذہن ہو تو اس وقت صفت اسم بن جاتی ہے۔ اللہ کی صفات کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) صفۃ الذات (۲) صفۃ فعل۔ صفت ذات وہ ہے جس کا مقابل نہ پایا جاتا ہو۔ مثلاً آپ کہیں "اللہ حیٌ"۔ اللہ زندہ ہے تو حیٌ یہ صفت ذات ہے جس کا مقابل نہیں پایا جاتا جو میت ہے۔ اور محی صفت فعل ہے کیونکہ اس کا مقابل ممیت پایا جاتا ہے اسی طرح عزیز صفت ذات ہے معز صفت فعل ہے کیونکہ اس کا مقابل مذل پایا جاتا ہے۔

احد اور واحد میں فرق

اختلاف اس میں نہیں کہ اللہ موجود ہے یا نہیں بلکہ اختلاف اس میں ہے کہ وہ ایک ہے یا نہیں معلوم ہوا کہ لفظ جلالۃ اللہ میں نزاع نہیں۔ نزاع تو اس کے بعد والے الفاظ میں ہے کہ وہ احد ہے یا نہیں۔ صمد ہے یا نہیں والد ہے یا نہیں مولود ہے یا نہیں

اس کی کوئی نظیر ہے یا نہیں۔ کلمہ احد کو جب ہم دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ واحد کے معنیٰ میں نہیں ہے۔ کیونکہ ایک چیز کبھی واحد ہوتے ہوئے بھی مرکب ہوتی ہے اور چیز جب مرکب ہو تو اجزاء کی محتاج ہوتی ہے واحد سے اس بات کی نفی تو ہو جاتی ہے کہ اس کے مثل کوئی واحد ہو، لیکن اس سے اس کے فی ذاتہ مرکب ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے پہلے مناطقہ کی ایک اصطلاح کل اور کلی جزء اور جزئی سمجھ لیں۔ کل جزء کے مقابلے میں ہوتا ہے - اور کلی جزئی کے مقابلے میں ہوتا ہے۔ کلی وہ جنس ہے جو ایسی کثیر چیزوں پر بولی جائے جنکی حقیقتیں ایک ہوں مثلاً لفظ انسان کلی ہے یہ زید، عمر، بکر، خالد، حامد سب پہ بولا جاتا ہے - اور سب کی حقیقتیں ایک ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم کیسے سمجھیں کہ سب کی حقیقتیں ایک ہیں تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم زید، عمر، بکر وغیرہ میں کسی کو موضوع بنائیں اور لفظ انسان کو اس کا محمول بنا دیں اور دیکھیں کہ قضیہ صحیح ہے یا نہیں۔ مثلاً ہم یہ کہیں زید انسان، عمرو انسان، بکر انسان ظاہر ہے کہ سارے قضیے صحیح ہیں اس سے پتہ چلا کہ ان سب کی حقیقتیں ایک ہیں خلاصہ یہ کہ کلی اپنی جزئیات میں سے ہر ہر جزئی کا جزء ہوتی ہے مگر کل کا معاملہ

ایسا نہیں ہے کیونکہ کل کا اطلاق کثیر بن پر تو ہوگا مگر اسکے افراد کی حقیقتیں جداجدا ہوں گی مثلاً کرسی جو بہت سی چیزوں مثلاً لکڑی، کیلوں، چمڑوں وغیرہ سے ملکر بنتی ہے اور کیل لکڑی چمڑا سب کی حقیقتیں الگ الگ ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ کیل کرسی ہے لکڑی کرسی ہے اس بحث سے ایک عجیب منطقی اصول معلوم ہوا کہ کلی جزء ہے اور جزئی کل ہے فافہم وتدبر۔

اتنا سمجھنے کے بعد اب لفظ واحد کو دیکھئے کہ یہ کلی ہے یا کل ہے تو جواب یہ ہے کہ واحد کل ہے۔ اور کلمہ احد۔ کلمۂ واحد کا غیر ہے یعنی کلمہ احد کل نہیں ہے۔

احد اور واحد کے فرق کی مزید تفصیل

اگرچہ قرآن حکیم نے توحید الٰہی کو لفظ واحد سے بھی بیان کیا ہے۔ مثلاً وھو الواحد القھار۔ لیکن یہاں اس کی شان یکتائی کا اظہار مقصود ہے یعنی وہ ایسا واحد ہے کہ اس میں کثرت کا کوئی شائبہ نہیں۔ نہ جنسی نہ نوعی نہ مقداری نہ عددی نہ اعتباری، اس لئے یہاں واحد کے بجائے احد کا لفظ استعمال کیا گیا۔ کیونکہ انسان کے دماغ میں واحد سے پہلے نصف (آدھا) اور واحد کے بعد اثنین (دو) کا تصور آسکتا ہے لیکن احد کا

لفظ ان دونوں تصورات کی نفی کردیتا ہے۔ یعنی اللہ ایسا "ایک" ہے کہ اس کی نظیر یا مثال کائنات میں کہیں موجود نہیں۔ یعنی لفظ احد میں وحدت ذاتی اور شان یکتائی دونوں تصورات مضمر ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی مشہور کتاب الاتقان فی علوم القرآن میں اس فرق کو مثال سے یوں واضح کیا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ فلان لا یقوم لہ واحد۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فلاں آدمی کے لئے ایک شخص نہیں کھڑا ہو رہا ہے بقیہ سب کھڑے ہوگئے۔

اور فلان لا یقوم لہ احد اس کا مطلب یہ ہوا کہ فلاں آدمی کے لئے کوئی نہیں کھڑا ہو رہا ہے۔ اہل لغت نے احد اور واحد میں یہ فرق بتایا ہے کہ "احد" وہ ہے جسکی ذات میں کوئی شریک نہ ہو اور واحد وہ ہے جس کی صفات میں اس کا کوئی شریک نہ ہو غالباً اسی وجہ سے لفظ احد اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لئے بطور صفت نہیں آیا ہے اس سے یکتائی اور بے ہمگی من کل الوجوہ سمجھی جاتی ہے

لفظ احد سے ثنویت کا رد

علامہ شہرستانی نے الملل والنحل کے حاشیے پر لکھا ہے کہ مجوسی

حنیفی کے با المقابل ہیں ۔ یہ ثنویت کے علم بردار تھے یعنی ان کا خیال تھا کہ خدا دو ہیں ۔ نور اور ظلمت ، اور یہی عالم میں خیر وشر اور نفع وضرر اصلاح وفساد کے ذمہ دار ہیں فارسی میں ان کو یزداں (خالق خیر) اور اہرمن (خالق شر) کہتے ہیں ۔ لفظ احد سے ثنویت کے باطل نظرئے کی تردید ہو گئی کیونکہ احد ایسے واحد کو کہتے ہیں جس میں کثرت کا کوئی شائبہ نہ ہو ۔ (یعنی مطلب یہ ہوا (۱) وہ ہمیشہ سے ہے اس وقت بھی تھا جب کچھ نہ تھا ۔ (۲) اس کے پہلے نہ کوئی خدا تھا نہ اس کے بعد ہوگا (۳) وہ ہمیشہ سے ہے اس کے سوا جو کچھ ہیں سب اسی کی مخلوق ہیں (۴) خداؤں کی کوئی جنس نہیں جس کا وہ فرد ہو ۔ قرآن میں ہے ۔ وَقَالَ اللّٰہُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ط اور اللہ نے کہا دو معبود نہ بناؤ بیشک وہ تنہا معبود ہے ، پس تم لوگ مجھ ہی سے ڈرا کرو ۔"

تعدد فی الالوہیت (یعنی الہ کئی نہیں ہیں) کی نفی پر ابن تیمیہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں ۔ ما اتخذ اللّٰہُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا کَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ کُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ط اللہ نے کسی کو اولاد قرار نہیں دیا اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہی

اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو تقسیم کر کے جدا کر لیتا اور ایکدوسرے پر چڑھائی کرتا ۔ آیت مذکورہ میں پہلے اس بات کی نفی کی گئی ہے کہ اللہ کا کوئی بیٹا ہو جس کی عبادت کر کے اللہ کا تقرب حاصل کیا جائے ۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی نفی ہو گئی کہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان کوئی الہ واسطہ ہے ، دوسرے اس بات کی بھی اس آیت کریمہ سے نفی ہو گئی کہ معبود متعدد ہوں ۔ کیونکہ اگر الہ واحد کے ساتھ کسی اور کو بھی مستحق عبادت تسلیم کر لیا جائے تو یہ امر دو حال سے خالی نہیں

(۱) یہ کہ ہر الہ قادر ہوگا تو لازم آئے گا کہ ہر خدا اپنی مخلوق کو جدا کر لیتا ۔

(۲) ایک الہ قادر ہو دوسرا نہ ہو، تو یہ ماننا لازم آئے گا کہ ہر معبود دوسرے پر چڑھائی کر لیتا اور یہ معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہے ۔ ثابت یہ ہوا کہ قادر صرف ایک الہ ہوگا ۔ اور وہی مستحق عبادت ہوگا ۔ آیت مذکورہ میں دو لازم ہیں ۔ اور مشاہدہ دونوں لازموں کی نفی کرتا ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک کی نفی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ایک الہ کے علاوہ کوئی اور الہ نہیں ہو سکتا جس کی عبادت کی جائے ۔

دوسری دلیل قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا
فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ
مِّنْ ظَهِيْرٍ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ
اَذِنَ لَهٗ ؕ "تو کہہ کہ جن لوگوں کو تم اللہ کے سوا کچھ سمجھ بیٹھے ہو وہ ذرہ بھر کے مالک نہیں آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کچھ حصہ ہے۔ اور نہ اللہ کا ان میں سے کوئی مددگار ہے۔ اور اس کی شفاعت کام نہ دیگی مگر جس کے لئے وہ اذن فرمائے"

اس آیت میں مشرکین سے سوال کیا گیا ہے کہ اللہ کے علاوہ جنکی تم عبادت کرتے ہو یہ مستقل طور پر یا شرکت کے طور پر زمین اور آسمان میں ذرہ برابر مالکانہ حق رکھتے ہیں؟ اور یا ان میں سے کسی نے زمین اور آسمان کی تخلیق میں امداد کی ہے؟ مشرکین اس سوال کے جواب میں خاموش ہیں۔ اور ان کا یہ سکوت اس بات پر دلالت کررہا ہے کہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ زمین اور آسمان میں ذرہ برابر مالکانہ حق نہیں رکھتے اور انہوں نے تخلیق میں معاونت بھی نہیں کی ہے۔ پھر قرآن ایک دوسرے قضیے کی نفی کے لئے آگے بڑھتا ہے اور مشرکین سے کہتا ہے کہ شفاعت اس

کے حضور وہی کرسکتا ہے جسے وہ شفاعت کی اجازت دے جس سے مشرکین کا یہ دعویٰ باطل ہوتا ہے۔ کہ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ پس معلوم ہوا کہ وہ جو نہ مستقل طور پر نہ شرکت کے طور پر تخلیق کرسکے وہ مستحق عبادت نہیں ہوسکتا۔

تفسیر الصمد

ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ صمد اس سردار کو کہتے ہیں جسکی سرداری کامل ہو۔ سدی سے مروی ہے کہ صمد کا اطلاق اس پر ہوتا ہے کہ جس کی طرف لوگ آرزوئیں لیکر جائیں اور مصیبتوں کے وقت اس سے فریاد کریں۔ سعید بن جبیر سے منقول ہے کہ صمد وہ ہے جو اپنے سارے افعال وصفات میں کامل ہو۔ مقاتل بن حیان سے مروی ہے کہ صمد وہ ہے جس میں کوئی عیب نہ ہو۔ زجاج کا قول ہے کہ صمد وہ ہے جس پر سیادت ختم ہوجاتی ہو۔ ہر چیز کا صمود اس کی طرف ہو۔ یعنی ہر شیٔ اس کا قصد کرے۔ اسی طرح جب لوگ کسی گھر کی طرف بوقت حاجات جانے کا ارادہ کریں۔ تو وہ گھر بیت مصمود یا بیت مصمد کہا جاتا ہے۔ طرفہ کا شعر ہے

وان یلتق الحی الجمیع تلاقنی
الی ذروۃ البیت الرفیع المصمد

"اور اگر سارا قبیلہ جمع ہو تو بلند مکان کی چوٹی پر وہ مجھ سے ملاقات کر سکے گا۔"

ابن عطاء کا قول ہے کہ صمد وہ ہے جو بننے بگڑنے سے بالا تر ہو۔ قتادہ کا قول ہے کہ صمد وہ ذات ہے جو اپنی مخلوقات کے بعد بھی باقی رہے۔

مرۃ الہمدانی سے مروی ہے کہ صمد وہ ذات ہے جسے کہنگی اور فنا لاحق نہ ہو، محمد بن کعب قرظی اور عکرمہ سے مروی ہے کہ صمد اس چیز کا نام ہے جس میں سے کچھ نکل نہ سکے۔ میسرہ سے مروی ہے کہ انہوں نے صمد کے معنیٰ مصمت (ٹھوس چیز) بتائے ہیں۔

ابن قتیبہ کا قول ہے کہ صمت دراصل صمد ہی ہے۔ گویا ت، د، سے بدل گئی ہے۔ لیکن ابن تیمیہ کے نزدیک یہاں ابدال نہیں اشتقاق اکبر ہے۔

(اشتقاق کی توضیح)

اشتقاق کا مطلب ہے:۔ اخذ کلمۃ من کلمۃ اخری

یعنی ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے نکالنا ماخوذ منہ (جس سے نکالا گیا ہو) اصل ہوتا ہے اور ماخوذ (جو نکالا گیا ہو) فرع ہوتا ہے۔

اشتقاق کی تین قسمیں ہیں

(۱) اشتقاق اکبر (۲) اشتقاق اصغر (۳) اشتقاق اوسط

اگر ماخوذ منہ اور ماخوذ کے کچھ حروف میں اشتراک عینی ہو اور کچھ حروف میں اشتراک جنسی ہو تو اشتقاق اکبر ہے مثلاً حزر، عزر، ازر ان تینوں لفظوں کو دیکھئے کہ ہر ایک کے آخری دو حرف ایک جیسے ہیں۔ یہ اشتراک عینی ہے۔ اور تینوں لفظوں کے شروع کے حروف مثلاً ح۔ ع۔ ا اگرچہ ایک جیسے نہیں مگر ان کی جنس مشترک ہے کیونکہ تینوں حروف حلقی ہیں۔ اگر ماخوذ منہ اور ماخوذ کے کلموں کے حروف اور ترتیب دونوں میں موافقت ہو تو اشتقاق اصغر ہے جیسے صدق۔ اور صادق۔ اور اگر ماخوذ منہ اور ماخوذ کے کلموں کے حروف کے درمیان موافقت ہو مگر ترتیب میں عدم موافقت ہو تو اشتقاق اوسط ہے۔

اس تشریح کی روشنی میں جوہری کا قول دیکھئے وہ کہتے ہیں کہ لغت میں مصمد کے معنیٰ مصمت کے ہیں۔ اور

صمت اس چیز کو کہتے ہیں جس میں کھوکھلا پن نہ ہو۔ یہاں ظاہر ہے کہ مصمدؔ اور مصمت میں اشتقاق اکبر ہے۔ لیکن مصمد بلحاظ معنیٰ مصمت کی نسبت زیادہ کامل ہے کیونکہ مصمد میں دال ہے اور مصمت میں "ت" اور "د" "ت" سے زیادہ قوی ہے۔ یحییٰ بن کثیر کا قول ہے کہ فرشتے صمد ہیں۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ خدا کی مخلوقات میں سے ہیں جب وہ صمد ہیں اور کھاتے پیتے نہیں تو ان کے خالق میں غنا اور کمال بطریق اولیٰ موجود ہونا چاہئے۔ اسی طرح بعض اسلاف کرام نے صمد کی تفسیر میں بیان فرمایا کہ جو نہ کھائے اور پئے۔

الصمد سے الوہیت مسیح کا رد

قاعدہ عقلیہ ہے کہ جب دو نقیضوں میں سے ایک کو باطل کر دیا جائے تو دوسری کا وجود ضرور ثابت ہوتا ہے۔ یا ایک کا وجود ثابت ہو تو دوسری کا عدم ہو جائے گا مثلاً ثابت کیا جائے کہ کسی خاص وقت میں رات نہیں ہے تو دن ضرور ہوگا اور اگر ثابت کیا جائے کہ کسی خاص وقت میں دن ہے تو رات نہ ہوگی۔ اس قسم کی دلیل کو علماء مناظرہ "دلیل خلف" کہتے ہیں۔ اور جو حکم تتبع اور تلاش کے بعد لگایا گیا ہو

اسے استقراء کہتے ہیں۔ جیسا کہ کسی مدرسے کے بعض طلباء سے ملنے پر انہیں با اخلاق پانے پر یہ حکم لگا دینا کہ اس مدرسے کے تمام طلباء با اخلاق ہیں یہ بھی ایک قسم کی دلیل ہے مگر دلیل خلف کی بہ نسبت زیادہ کمزور ہے اور جو حکم بطور مشابہت لگایا جائے اس کو تمثیل کہتے ہیں جیسے شراب پر حرمت کا حکم دیکھا جس کی علت نشہ ہے اب بھنگ کے اندر نشہ معلوم ہونے پر اس پر بھی حرمت کا حکم لگا دیا اس میں شراب مقیس علیہ اور بھنگ مقیس ہے اور علت نشہ ہے جو دونوں میں مشترک ہے انہیں تینوں دلائل کی طرف قرآن نے اشارہ کر کے فرمایا۔

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ط یہ کہنا کہ مسیح تو صرف ایک اللہ کا رسول ہے تمثیل ہے یعنی جیسے اور رسول ہیں جن کو بندگی سے بڑھ کر خدائی میں ذرہ برابر دخل نہیں اسی طرح مسیح بھی اللہ کا رسول ہے نہ کہ خدا۔ اور یہ کہنا کہ اس سے پہلے بہت سے رسول گذر چکے استقراء کی طرف اشارہ کیا یعنی کل رسول جو خدا کی طرف سے آئے ہیں ان کے لئے بجز بندگی کے اور کوئی مرتبہ

نہیں ہوا پھر مسیح کا کیونکہ ہونے لگا اور یہ کہنا کہ مسیح کی ماں نیک بندی تھیں اور مسیح اور ان کی والدہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ اسی بڑی زبردست دلیل کی طرف اشارہ ہے جسے دلیل خاف کہتے ہیں

یعنی جب مسیح کی ماں تھی اور وہ بھی خدا کی نیک بندی تھی اور ماں بیٹے دونوں کھانے کے محتاج تھے تو ایک وجہ سے نہیں بلکہ کئی وجہ سے مسیح کی عبدیت ثابت ہوئی۔

(۱) ایک تو یہ کہ اس کی ماں ہے جس نے مسیح کو جنا۔

(۲) اس کی ماں خدا کی تابعدار بندی تھیں۔ تو بیٹا بھی ضرور بالضرور خدا کا بندہ اور تابعدار ہوگا۔

(۳) دونوں ماں بیٹا طعام کے محتاج تھے ایسے کہ جیسے اور لوگ محتاج ہوں اور ظاہر ہے کہ جو محتاج الی الغیر ہو وہ مخلوق ہے وہ کبھی خدا نہیں ہوسکتا۔ اور ابھی آپ نے پڑھا ہے کہ وہ الصمد ہے۔ اور صمد وہ ہے اَلَّذِیْ لَا یَاکُلُ وَلَا یَشْرَبُ (جو کھائے نہ پیئے) کیونکہ اگر خدا بھی طعام وغیرہ کا محتاج ہو تو اس میں شک نہیں کہ طعام بلکہ دنیا کی کل چیزیں حادث ہیں۔ یعنی ایک وقت سے ان کی ابتداء ہوئی ہے۔ جس سے پہلے وہ نہ تھیں۔ پس جس وقت

وہ نہ تھیں۔ تو ان کے بغیر خدا کا گذارہ کیسے چلتا تھا۔ یا خدا بھی اس وقت نہ تھا تو خدا بھی حادث ہوا یا تھا تو مگر بڑی دقت سے گذارہ کرتا ہوگا کیونکہ اس بات کو ہمارے مخالفین یعنی عیسائی بھی مانتے ہیں کہ جو کھانے وغیرہ کا محتاج ہو۔ وہ بیشک مخلوق ہوگی۔ پس قرآن سے تینوں دلیلوں کی شرح ہوگئی۔

ولادت کے معنیٰ

لم یلد ولم یولد وہ نہ والد ہے۔ نہ مولود ہے۔

ولادت اور تولد کے معنیٰ ہیں "پیدا ہونا" اور کسی چیز کے پیدا ہونے کے لئے پہلے دو اصلوں کا ہونا ضروری ہے۔ خواہ یہ دو اصل متولد یعنی اس پیدا ہونے والی چیز کی جنس سے ہوں یا نہ ہوں۔ جس طرح حیوان میں توالد کے لئے دو اصلوں کا وجود لازمی ہے۔ اسی طرح غیر حیوان میں بھی توالد دو اصلوں ہی سے ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کسی بھی تیسری چیز کے وجود میں آنے کے لئے پہلے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں جس سے تیسری چیز وجود میں آتی ہے وہ دونوں بھی ایک دوسرے کی مخالف جنس ہونی چاہیئیں۔ اس اصول کی روشنی میں آگ کو دیکھئے کہ زندین یعنی چقماقوں کے رگڑنے

سے پیدا ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کون سی چیز آگ بن
گئی ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ دو چقماقوں کے درمیان جو ہوا
ہے وہ آگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ کیونکہ ہوا منقلب
ہو کر آگ بنتی تو نیچے نہ گرتی۔ کیونکہ ہوا کا خاصہ (صعود
اوپر کو جانا ہے نہ کی ہبوط نیچے کی طرف گرنا۔ ثابت یہ ہوا کہ
دو چقماقوں میں سے نیچے کی چیز مثلاً صوفان اور حراق پر چنگاری
پیدا کی جاتی ہے رگڑ کے باعث ان سے مادہ خارج ہوتا ہے۔
یہی مادہ جب آگ میں تبدیل ہو چکتا ہے تو پاس کی ہوا
بھی آگ میں تبدیل ہو جاتی ہے پتھر سے اگر ثقیل مادہ خارج
نہ ہو تو آگ نیچے نہیں گرتی جبکہ رگڑ کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ
آگ نیچے ہی گرتی ہے۔ قرآن کی آیت فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ
تُوْقِدُوْنَ ؕ کا اشارہ چقماق کی طرف ہے اہل لغت جوہری
وغیرہ نے کہا ہے کہ زَنْدٌ (اس چیز کو کہتے ہیں جس کو رگڑ کر
آگ نکالی جاتی ہے زند اوپر والے چقماق کو کہتے ہیں نیچے
کے چقماق کو زندہ کہتے ہیں اوپر والا چقماق نر کہلاتا ہے اور نیچے
والا چقماق مادہ کہلاتا ہے، مادہ چقماق میں سوراخ ہوتا ہے
دونوں چقماق جمع ہو جائیں تو زَنْدَین (دو چقماق) کہلاتے ہیں۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ جس مقام پر چقماق کو رگڑا جاتا ہے
وہ عورت کی رحم کی شکل کا ہوتا ہے اس جگہ آگ کا لوتھڑا
بنتا ہے جسے حراق اور صوفان کہا جاتا ہے اور دوسری چیزوں
کی بہ نسبت زیادہ تیزی کے ساتھ آگ پکڑ لیتا ہے اور جس
طرح بعض اوقات عورت کے رحم میں لوتھڑا نہیں بنتا اسی
طرح چقماق میں بھی کبھی لوتھڑا نہیں بنتا۔ اب دیکھئے آگ
زندین کی جنس سے نہیں ہے اور زندین بھی مخالف جنس والے
ہیں۔ قرآن میں ہے۔ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ
الْاَخْضَرِ نَارًا ؕ وہ اللہ ہے جس نے تمہارے لئے سبز
درخت سے آگ پیدا کی۔ متعدد مفسرین کا قول ہے کہ دو درخت
ہوتے ہیں ایک کا نام "مرخ" اور دوسرے کا نام عفار ہے جو
شخص اس سے آگ نکالنا چاہتا وہ ان دو درختوں سے
مسواکوں کے برابر دو سبز ٹہنیاں کاٹ لیتا ان سے خواہ پانی
کے قطرے گر رہے ہوں۔ لیکن اگر مرخ کو عفار پر رگڑا جائے
تو ان دونوں سے آگ نکل آتی۔ ان دو درختوں میں سے مرخ
نر درخت اور عفار مادہ درخت کہلاتے ہیں۔

عرب کہتے ہیں کہ ہر درخت میں آگ ہوتی ہے مگر مرخ اور عفار
کو سب پر امتیاز حاصل ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عناب

کے علاوہ ہر درخت میں آگ ہوتی ہے یہاں بھی دیکھئے کہ آگ مرخ اور عفار کی جنس سے نہیں ہے پس معلوم ہوا کہ جس طرح مرد و عورت کے مادہ سے بچہ تولد ہوتا ہے اسی طرح آگ بھی نر اور مادہ سے خارج ہونے والے مواد سے ہی بنتی ہے

حیوان متولد و حیوان متوالد

حیوان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم تو متولد حیوانوں کی ہے جیسے وہ کیڑے جو پھل پھول اور سرکہ وغیرہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یا مثلاً جوئیں جو جِلد انسانی کی مَیل کچیل سے پیدا ہوتی ہیں۔ یا چوہے۔ پسّو وغیرہ جو پانی اور مٹی سے پیدا ہوتے ہیں۔

دوسری قسم متوالد حیوان کی ہے، مثلاً چوپائے وغیرہ جو ماں باپ سے پیدا ہوتے ہیں۔ رہا انسان کا معاملہ، تو اس کی ولادت اور تخلیق کی ممکنہ اقسام چار ہیں۔

(۱) حضرت آدمؑ بغیر مرد و عورت کے پیدا کیے گئے۔

(۲) حضرت حواؑ بلا عورت کے پیدا کی گئیں۔

(۳) حضرت عیسیٰ عورت سے بلا مرد کے پیدا کیے گئے

(۴) بقیہ مخلوق مرد و عورت سے پیدا کیے گئے

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اصول یہ ہے کہ جمیع متولدات

(تمام پیدا ہونے والی چیزیں) دو اصلوں سے پیدا کی گئی ہیں تو مذکورہ بالا تخلیق کی چار قسموں میں سے ابتدائی تین قسموں میں یہ اصول ٹوٹ رہا ہے کیونکہ ان تینوں قسموں کی تخلیق دو اصلوں سے نہیں ظاہر ہو رہی ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ تینوں میں وہی اصول کارفرما ہے۔ اصول کہیں ٹوٹا نہیں ہے حضرت آدم کو دیکھئے کہ ان کی اصل دو چیزیں ہیں۔ مٹی۔ پانی۔ وہ نہ صرف مٹی جس میں پانی نہ ملا ہو کوئی جاندار چیز یا سبزی نہیں پیدا ہو سکتی۔ سبزی بھی ساری کی ساری دو اصلوں سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی حال حوّا کا ہے کہ وہ حضرت آدم کی پسلی سے بنائی گئی ہیں تو ان کی بھی تخلیق کے دو ہی اصل ہوئے رہا معاملہ حضرت مسیح بن مریم کا، تو جاننا چاہیئے کہ حضرت عیسیٰ صرف مریم سے نہیں ہوئے بلکہ مریم اور نفخ جبرئیل (جبرئیل کی پھونک) سے پیدا ہوئے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ۝ فَحَمَلَتْهُ

تو ہم نے مریم کی طرف جبرئیل کو بھیجا وہ ایک پورے آدمی کی شکل میں ان کے سامنے کھڑے ہوئے، آپ کہنے لگیں کہ میں

تجھ سے اللہ کی پناہ چاہتی ہوں اگر تو خدا ترس ہے تو میرے
سامنے سے ہٹ جا۔ جبرئیل نے کہا میں تیرے رب کا بھیجا
ہوا آیا ہوں اسلئے کہ تجھے ایک پاکیزہ بچہ دوں پس وہ
حاملہ ہوگئیں۔ یعنی جب جبرئیل نے پھونکا تو حضرت
مریم کو حمل رہ گیا۔ اسی لئے حضرت مسیح کو اسی نفخ کے اعتبار
سے "روح منہ" کا خطاب ملا۔

اس تفصیل سے بتانا مقصود یہ ہے کہ قائم وجودوں میں
سے جس چیز کے متعلق بھی تولد (پیدائش) کا لفظ استعمال
کیا جائے گا یہ ضروری ہے کہ وہ دو اصلوں سے بنی ہو اور
دونوں میں سے کچھ کچھ حصہ جدا ہو کر بنی ہو۔ اگر اللہ کو والد
مان کر یہ کہا جائے کہ اللہ کا کوئی مولود (بیٹا) ہے تو لابدی ہے
کہ والد سے کچھ مادہ خارج ہو کر اس سے جدا ہو جائے اور دوسرے
دو اصلوں سے تولد ہوا ہو اور اللہ چونکہ صمد ہے اس لئے امر
محال ہے کہ اس سے کوئی چیز خارج ہو کیونکہ جتنا بھی اس سے
خارج ہو کر الگ ہو گا۔ ظاہر ہے اتنا نقص اس کی ذات میں
لازم آئے گا جبکہ اللہ کی ذات تمام نقائص سے مبرا ہے۔

دوسرے اللہ کے لئے بیوی ہونا بھی ممتنع ہے۔ اللہ تعالیٰ
نے فرمایا وَلَمْ تَكُن لَّهُ صَاحِبَةٌ "اور اسکی کوئی بیوی نہیں"

اور اگر اس کے لئے کوئی مولود بیٹا مانا جائے تو اولاد باپ کا
جز ہوتی ہے جبکہ اس کا کوئی جز نہیں ہو سکتا۔ اللہ کا ارشاد
ہے وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا "انہوں نے خدا
کے بعض بندوں کو اس کا جز یعنی اولاد قرار دے رکھا ہے

خروج کلام کی تصریح

بعض سلف نے کہا کہ صمد وہ ہوتا ہے جس سے کوئی چیز نہیں
نکلتی اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ کلام نہیں کرتا کیونکہ قرآن
اللہ کا کلام ہے جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کلام اس
سے نکلا ہے۔ متکلم کے منہ سے کلام کے نکلنے کے معنیٰ یہ ہیں
کہ وہ بات کرتا ہے اور اس سے بات سنی جاتی ہے اور دوسرے
آدمی تک پہنچ جاتی ہے۔ دوسرے میں پیدا نہیں ہوتی جیسا کہ
جہمیہ کا قول ہے۔ یہ خروج (نکلنا) اس معنیٰ میں نہیں ہوتا کہ جو
اشیاء متکلم کے ساتھ قائم ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز جدا ہو کر
دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ یہ بات تو مخلوقات کے
صفات سے بھی بعید ہے کہ صفت اپنے محل کو چھوڑ کر
غیر محل میں چلی جائے۔ چہ جائے کہ خالق جل جلالہ کی صفات کے
ساتھ یہ کیفیت وارد ہو۔ علم و کلام کی شان یہ ہے کہ جب عالم اور

متکلم سے استفادہ کیا جاتا ہے تو علم اور کلام اپنے محل یعنی عالم اور متکلم سے گھٹتا نہیں ہے وہ ایک روشنی جس سے ہر شخص ضیاء اندوز ہوتا ہے اور وہ روشنی اپنے محل میں علیٰ حالہ قائم رہتی ہے۔ ذرا بھی نہیں گھٹتی، اس مخلف کا یہ قول کہ الصمد وہ ہوتا ہے جس سے کوئی چیز نہ نکلے اس معنیٰ میں صحیح ہے کہ اس سے کوئی چیز جدا نہیں ہوتی۔

ابنیت اور مولودیت کا رد

قرآن کریم نے مولودیت و ابنیت کی تردید اس لئے کی کہ نزول قرآن سے پہلے جس طرح اور بہت سے غلط اور گمراہ کن عقائد دنیا کی قوموں میں مقبول اور مروّج تھے اسی طرح یہ مہمل اور لغو عقیدہ بھی مختلف اقوام میں موجود تھا۔ مثلاً یونان میں "اپالو"، شام میں بیکس (Bacches) مصر میں "ہورس"، اور عراق میں "متھرا" کو خدا کا اکلوتا بیٹا تسلیم کیا جاتا تھا۔ انہیں اقوام کی تقلید میں یہود نے عزیرؑ کو اور نصاریٰ نے عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیا تھا۔ قرآن کریم کے دسویں پارے میں ہے: وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللهِ ط یہود

نے کہا کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ عیسائیوں کا جو فرقہ حضرت مسیح کے اللہ کا بیٹا ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے وہ ملکانیہ ہے۔

اگر کوئی خدا کا بیٹا ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کی حیثیت کیا؟ اگر وہ بھی خدا ہے تو خدا دو ہوگئے اب سوال یہ ہے کہ یہ دونوں ملکر کائنات کا نظام چلا رہے ہیں یا ان میں سے کوئی معطل ہے یا خدائی ان میں منقسم ہے اگر پہلی صورت تسلیم کی جائے تو سوال یہ ہے کہ بیٹے کی ولادت سے پہلے اکیلا خدا اس کائنات کا انتظام کیسے کرتا تھا۔ اگر کر سکتا تھا تو بیٹے کا وجود بیکار ہوا اگر دوسری صورت صحیح ہے تو سوال یہ ہے کہ معطل اور بیکار خدا کو خدا تسلیم کرنے سے ہمیں کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر تیسری صورت تسلیم کر لی جائے تو سوال یہ ہے اس کائنات کا کونسا حصہ باپ کے زیر اقتدار ہے اور کونسا بیٹے کے؟

مولودیت کے عقیدے کی لغویت واضح کرنے کے لئے مثالاً چند اعتراض میں نے کر دیئے ہیں اگر اس بحث کو مستقل طور پر لکھا جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ کائنات میں کوئی ایسی ہستی نہیں جو اس کے ساتھ برابری کا دعوی کر سکے۔

اللہ نے قرآن میں اپنے رسول کو بکثرت مقامات پر تسبیح کا حکم دیا ہے تسبیح تنزیہ کو کہتے ہیں۔

تنزیہ یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز پائی جائے جس کی کوئی نظیر نہ ہو نہ شکل میں نہ اور کسی چیز میں۔ مثلاً اللہ وجود کی صفت سے متصف ہے اور اس کی مخلوق بھی صفت وجود سے متصف ہے۔ لیکن اللہ کا وجود مخلوق کی وجود کی طرح نہیں ہے کیونکہ مخلوق کا وجود عدم سے ہے پھر اس کا وجود عدم کی طرف چلا جائے گا۔ اور اللہ کا وجود نہ علام سے ہے نہ عدم کی طرف جائیگا یہاں دیکھئے وجود کی صفت قدر مشترک ہے مگر آپ نے اللہ تعالیٰ کو منزہ کر دیا کہ اس کی مخلوق کسی بھی چیز میں اسکے مساوی نہیں۔ اور جب آپ سنیں کہ اللہ تعالیٰ کا چہرہ ہے، اس کی پنڈلی ہے اس کے ہاتھ ہے پیر ہے تو آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس کا چہرہ، ہاتھ، پیر اور پنڈلی مخلوق کے چہرے ہاتھ، پیر اور پنڈلی کی طرح ہے۔ بیشک، ہمارے رب کا وجود ہے۔

آنکھ، کان، ناک، ہاتھ پیر ہیں مگر یہ وجود اور آنکھ، کان، ہاتھ پیر مخلوق کے وجود اور آنکھ، کان، ہاتھ کی طرح نہیں ہیں ایک اور مثال لیجئے، دیکھئے اللہ حیّ (زندہ) ہے اور انسان بھی حیات سے متصف ہے۔ تو کیا انسان کی حیاۃ اللہ کی حیات کی طرح ہے ہرگز نہیں۔ خلاصہ یہ نکلا کہ اللہ کے ناموں میں سے کوئی نام یا اس کے اوصاف میں سے کوئی وصف آئے جس نام اور وصف کا مثل مخلوق میں بھی پایا جاتا ہو، تو ہمارے سامنے دو باتیں ہیں (۱) تمثیل اور (۲) تعطیل

تعطیل کا مطلب یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اللہ کے پاس کان نہیں، کیونکہ مخلوق کے پاس کان ہیں۔ کیا ہم ایسا کہہ سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں کیونکہ اللہ نے خود اپنے لئے کان ثابت کیا ہے تو آپ کو ماننا ہے کہ اس کے کان ہیں مگر اس کان کی کیفیت کیا ہے یعنی وہ کان کیسا ہے یہ تمہارا کام نہیں اور نہ یہ کیفیات محل ایمان ھیں جب آپ دیکھیں کہ اللہ نے اپنے آپ کو کسی وصف سے متصف کیا ہے جو ممکن ہے کہ اس کی مخلوق میں بھی پایا جاتا ہو، تو آپ کو تنزیہ کرنا ہے یعنی آپ کو کہنا ہے کہ "یہ" "اس" کے مثل نہیں۔

مسئلہ توحید کے متعلق پہلے تمام مذاہب میں جو حقیقت میں توحید کا پیغام لیکر دنیا میں آئے تھے تین اسباب سے غلط فہمیاں اور گمراہیاں پیدا ہوئیں۔

(۱) جسمانی تشبیہ و تمثیل (۲) صفات کو ذات سے سے الگ اور مستقل ماننا (۳) افعال کی نیرنگیوں سے دھوکہ کھانا،

جسمانی تشبیہ و تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو اور خدا کی صفتوں کو، اور خدا اور بندے کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کے لئے مادی تمثیلیں اور تشبیہیں ایجاد کرلی جائیں جیساکہ دیگر مذاہب کے معتقدوں نے ایجاد کیں۔ غلط فہمیوں کا دوسرا سبب صفات کا مسئلہ ہے یعنی صفات کو ذات الٰہی سے الگ مستقل وجود کے طور پر تسلیم کرنا۔ ہندوؤں کے عام مذاہب میں خداؤں کا جو لاتعداد لشکر نظر آتا ہے وہ حقیقت میں اسی غلطی کا نتیجہ ہے کہ ہر صفت کو انہوں نے علیحدہ اور ایک مستقل وجود مان لیا اس طرح ایک خدا کے ۳۳ کروڑ خدا بن گئے ہندو مذہب کے فرقوں پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی ایک مسئلہ

صفات کے تجسیم اور مستقل وجود کے تخیل سے مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔

خدا کی تین بڑی صفتیں

(۱) خالقیت، پیدا کرنا (۲) قیومیت، قائم رکھنا (۳) ممیتیت فنا کرنا۔

ہندو فرقوں نے ان تین صفتوں کو تین مستقل شخصیتیں تسلیم کرلیا اور برہما[1] وشنو[2] اور شیو[3]۔ خالق[1] قیوم[2] ممیت[3]، تین مستقل ہستیاں بن گئیں۔ یہی حال عیسائیوں کا ہوا انہوں نے خدا کی تین دیگر بڑی صفتوں حیات، علم، ارادہ کو تین مستقل شخصیتیں تسلیم کرلیا۔ حیات باپ ہے۔ علم روح القدس ہے، ارادہ بیٹا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں ایک ذات کی صفتیں ہیں صفات کے تعدد اور اختلاف سے موصوف میں تعدد اور اختلاف نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک آدمی کسی کا باپ ہے، کسی کا بھائی کسی کا خاوند اور کسی کا چچا، کسی کا بھتیجہ ہے۔ ان تمام

مختلف القاب کے باوجود یہ شخص واحد ہی رہتا ہے جب کثیف چیزوں کا یہ حال ہے تو خدا کی صفات کے تعدد سے اس کی ذات میں تعدد کس طرح سے پیدا ہو سکتا ہے وہ تمام موجودات سے زیادہ لطیف بلکہ سرچشمہ لطافت ہے۔ گمراہی کا تیسرا سرچشمہ افعال کی نیرنگی ہے۔ لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ ان مختلف افعال کی کرنے والی مختلف ہستیاں ہیں۔ کوئی ہستی مارتی ہے کوئی جلاتی ہے، کوئی لڑاتی ہے کوئی صلح کراتی ہے، کوئی علم کا دیوتا ہے کوئی دولت کی دیوی ہے۔ ان نادانوں نے یہ نہیں سمجھا کہ یہ ایک ہی ہستی اللہ سبحانہ تعالیٰ کے افعال ہیں

صفات لا عین اور لا غیر ہیں

خدا کی صفات کی دو قسمیں ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ ان کو صفت ذات اور صفت فعل سے تعبیر کرتے ہیں۔ خدا کی صفات ذاتیہ کا تعلق اس کی ذات سے ایسا ہی ہے۔ جیسے پھول کے ساتھ رنگ و بو، آفتاب کے ساتھ حرارت اور روشنی۔ آگ کے ساتھ گرمی

کا تعلق و قیام ہے۔ رہی صفت فعل تو یہ وہ صفت ہے، جو کسی معلول اور مفعول کے ساتھ تعلق کی وجہ سے خدا کے لئے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً آگ کی تو ایک صفت حرارت ہے جو اس کی ذاتی ہے۔ جب آگ کا وجود ہو گا تو حرارت ضرور ہو گی اور ایک صفت ہے جلانا۔ تو ظاہر ہے کہ یہ صفت اس رابطہ پر دلالت کرتی ہے جو آگ کے اور کسی چیز کے درمیان پایا جاتا ہے۔ صفت فعل، صفت ذات کا ہی پرتو ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ صفت اس تعلق کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جو کسی دوسری شیء کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لئے اس صفت کو ذات موصوف سے وہ تعلق نہیں ہوتا جو صفت ذات کو ہوتا ہے اس بنا پر اس صفت کا ظہور جو مختلف شکلوں اور صورتوں میں ہوتا ہے اس کا اثر ذات پر کچھ نہیں ہوتا یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صفت کی وجہ سے ذات موصوف میں کچھ تغیر ہو گیا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ خدا میں کون کون سی صفتیں پائی جاتی ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جس ذات

گرامی کو اللہ کہتے ہیں وہ تمام صفات کمالیہ کا، مستجمع ہے اس کی واضح ترین دلیل یہ ہے کہ ہر شیٔ اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے تو ہر نقص کے مقابل میں کوئی کمال پایا جانا ضروری ہے۔ اب دیکھئے کہ انسان کا وجود ناقص ہے۔ تو لامحالہ اس کے مقابلے میں ایسا وجود پایا جانا ضروری ہے۔ جو کامل ہو۔ رہا اس سوال کا حل کہ صفات عین ذات ہیں یا غیر ذات تو اس کا جواب یہ ہے کہ صفات باری تعالیٰ کو اس کی ذات سے ایسی نسبت ہے کہ ان صفات کو نہ عین ذات کہہ سکتے ہیں نہ غیر ذات مثال کے طور پر کسی ریڈیو اسٹیشن سے ایک تقریر نشر کی جاتی ہے اور آپ اسے اپنے ریڈیو سیٹ پر سنتے ہیں آواز کو کم یا زیادہ کرنے والے سوئچ کو گھما کر کبھی آپ آواز کو مدھم کرتے ہیں اور بلند کرتے ہیں آپ کے پیچ گھمانے سے مقرر کی اصل آواز میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی مقرر تو ایک ہی آواز سے اپنی تقریر پڑھتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ہلکا پن یا تیزی صفت کس کی

ہے۔ ظاہر ہے کہ آواز ہی کی صفت ہے اور دلیل یہ ہے کہ آواز کے گھٹنے بڑھنے پر ہم بے تکلف بول اٹھتے کہ آواز کم ہوگئی یا زیادہ ہوگئی کوئی شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ اللہ کی ایک صفت متکلم ہے۔ اس نے موسیٰؑ کو ندا دی اور انہیں مخاطب کر کے کلام کیا تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو ازل میں ندا دی تھی، اور ان سے کلام کیا تھا اور وہ برابر ندا دیتا رہا۔ ابن تیمیہ نے فرمایا کہ ذات باری کے ساتھ حوادث کا قیام ہو سکتا ہے۔ اس کا موسیٰ سے کلام اور مخاطبت ازل میں نہیں تھی بلکہ حادث تھی اور متکلمین یہ کہتے ہیں کہ حوادث کا قیام اللہ کے ساتھ ناجائز ہے۔ لیکن حق وہی ہے جو ابن تیمیہ نے کہا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَمَّا جَآءَهَا نُودِيَ۔ پس جب موسیٰ وہاں آئے تو ان کو ندا دی گئی۔

دیکھئے اس میں ندا حضرت موسیٰ کی آمد سے موقت ہے۔ ابن تیمیہ کے اس قول سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ قرآن کے حروف کو حادث مانتے ہیں۔ بلکہ مطلب

یہ ہے کہ وہ عربی الفاظ و حروف جن سے انسانی کلام مرکب ہوتا وہ بلا شبہ حادث ہیں لیکن یہی الفاظ و حروف خدا کی صفت کا مظہر اور تجلی گاہ بن جاتے ہیں۔ تو اب ہم ان کو اپنے کلام کے الفاظ و حروف پر قیاس کر کے مخلوق اور حادث نہیں کہہ سکتے۔

جسم باری تعالیٰ پر بحث

لفظ جسم ایک نیا اور بتدعانہ لفظ ہے۔ کسی شخص کو یہ زیبا نہیں کہ وہ اس لفظ کو اللہ کے متعلق زبان پر لائے۔ قرآن و سنت سے کسی صحابی اور تابعی کے قول سے اور امت مسلمہ کے کسی امام کی تحریر و تقریر سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق نفیاً یا اثباتاً یہ لفظ استعمال کیا گیا ہو۔ ابن تیمیہ تفسیر سورہ اخلاص میں لکھتے ہیں کہ جس شخص نے جسم کا لفظ استعمال کیا اور اس سے مرکب مراد نہ لیا تو وہ لغت عرب کے دائرے سے نکل گیا۔ ظاہر ہے کہ جو چیز کسی دوسری چیز سے مرکب و مولف ہوتی ہے۔ وہ اس کی طرف محتاج ہوتی ہے اور صمد غنی ہوتا ہے مرکب کبھی

صمد نہیں ہو سکتا۔

جہمیہ معتزلہ اور بہت سے فلاسفہ اور باطنیہ صفات کے منکر ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اثبات صفات کے لئے جسم کا ہونا ضروری ہے اور جسم تو ہے نہیں اسلئے اللہ کے واسطے صفات کیسے ثابت ہو سکتی ہے ان کے نزدیک صفات ان اعراض کو کہتے ہیں جو ایک جسم کے ساتھ قائم ہوتے ہیں جس جسم کا حلیہ ان کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا پھر کہتے ہیں کہ رویت معائنہ کے بغیر نہیں ہو سکتی اور معائنہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب مرئی کسی خاص سمت میں ہو اور کوئی چیز کسی سمت میں اس وقت ہو سکتی ہے جب وہ جسم ہو، عقیدہ الطحاوی کے فاضل شارح نے لکھا ہے " اللہ تعالیٰ صفت کمال، یعنی صفات ذات اور صفات فعل دونوں کے ساتھ ہمیشہ سے متصف رہا ہے " کیونکہ خدا کی تمام صفات، صفات کمال ہیں۔ اور ان میں سے کسی ایک کا نہ ہونا۔ صفت نقص ہے۔

مسئلہ خیر و شر

تمام افعال کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک خیر اور ایک

شر، یا یوں کہئے کہ ایک اچھی اور دوسری بری۔
اس خیال سے کہ ایک ہی ذات سے خیر و شر کے دو متضاد کام نہیں ہو سکتے، زردشتیوں نے خیر کے لئے الگ خدا اور شر کے لئے الگ خدا ٹھہرایا۔ خالق خیر کا نام یزداں، اور خالق شر کا نام اہرمن رکھا۔ یہ غلطی اس وجہ سے ہوئی کہ وہ خیر و شر کی حقیقت نہیں سمجھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ خیر و شر دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ کوئی شیء اپنی اصل کے لحاظ سے نہ خیر ہے، نہ شر۔ وہ خیر و شر انسان کے صحیح یا غلط استعمال سے بن جاتی ہے۔ فرض کرلو آگ ہے اگر اس سے کھانا پکاؤ، یا انجن چلاؤ یا غریب آدمی کو تاپنے دو تو یہ خیر ہے اور اگر اسی آگ سے کسی غریب کا گھر جلا دو تو یہ شر ہے آگ اپنی اصل کے لحاظ سے نہ خیر ہے نہ شر۔ انسان اپنے استعمال سے اس کو خیر اور شر بنا دیتا ہے۔ چھری اور تلوار خود نہ خیر ہیں نہ شر۔ تم ان کو جیسا استعمال کرو ویسی ہیں، تاریکی نہ خیر ہے نہ شر، اگر تاریکی کو لوگوں کے گھروں میں چوری کا ذریعہ بناؤ تو شر ہے۔ اور اگر اپنے کو چھپا کر نیکیوں کے کرنے کا ذریعہ بناؤ تو خیر ہے

یہ کائنات بھی اپنی اصل کے لحاظ سے نہ ہدایت کرنے والی ہے نہ گمراہ کرنے والی تم اپنی عقل کے اختلاف سے ہدایت یاب ہوتے ہو یا گمراہ ہو جاتے ہو۔ قرآن میں ہے:

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۔

"اللہ اپنے کلام کے ذریعہ بہتوں کو گمراہ کر دیتا ہے اور بہتوں کو راہ راست دکھا دیتا ہے۔ اور انہیں کو گمراہ کرتا جو فاسق ہیں"۔

اس آیت اور اسی جیسی بہت سی آیتوں سے معلوم ہوگا کہ ہدایت اور ضلالت دونوں کی علت اللہ ہی ہے مگر دونوں کے لئے ابتدائی محرکات انسان ہی کے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ مذکورہ آیت سے معلوم ہوا کہ فسق انسان نے کیا، جس کے نتیجے میں گمراہ ہوا۔

خلاصہ یہ کہ خیر و شر ہر چیز کا ظہور اللہ ہی کی مشیت سے ہوتا ہے۔ لیکن خیر و شر میں فرق یہ ہے کہ خیر خدا کی رحمت کے اقتضا سے ظہور میں آتا ہے۔ اور شر انسان کے اپنے عمل سے مترتب ہوتا ہے۔ اس پہلو سے شر کا تعلق انسان کے اپنے نفس سے ہے۔ یہ حقیقت

یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ خیرِ مطلق ہے ، اس نے یہ
دنیا اپنی رحمت کیلئے بنائی ہے اس وجہ سے اس کی
طرف کسی شر کی نسبت اس کی پاکیزہ صفات کے منافی
ہے۔ اللہ نے انسان کو ایک خاص دائرے میں آزادی
بخشی ہے۔ یہ آزادی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔
پھر اس دائرے کے اندر بھی یہ خدا کی مشیت اور اس
کی حکمت کے تحت ہے خدا کی مشیت کے بغیر انسان
اپنے کسی ارادے کو پورا نہیں کر سکتا۔ انسان کے نیک
ارادے اسی کی توفیق بخشی سے پورے ہوتے ہیں اور
ہر ارادے بھی اس کے مہلت دینے سے بروئے کار آتے
ہیں۔ اگر اللہ کسی کے برے ارادے کو بروئے کار آنے
دیتا ہے اس پہلو سے تو وہ خدا کی طرف منسوب ہوتا ہے کہ
اس کا بروئے کار آنا خدا کی مشیت اور اذن سے ہوا لیکن
دوسرے پہلو سے وہ انسان کا فعل ہے کیونکہ اسکا ارادہ
انسان نے خود کیا۔

اِنّا اور نحنُ کی بحث

نجران کے نصاریٰ نے کہا تھا کہ ہماری دلیل قرآن میں

قرآن میں موجود ہے۔ قرآن میں اِنّا اور نحنُ
جمع کے الفاظ ہیں۔ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ معبود
تین ہیں کیونکہ جمع کا اطلاق کم سے کم تین پر
ہوتا ہے۔ ان نصرانیوں نے محکمات قرآنیہ کو
چھوڑ دیا اور متشابہ آیات کے پیچھے پڑ گئے، محکم
آیات میں صاف مذکور ہے کہ معبود ایک ہے۔
اِنّا اور نَحنُ کے الفاظ کی بحث چھیڑ کر ان
کی غرض فتنہ برپا کرنا، اور لوگوں کے دلوں میں کفر
پیدا کرنا تھا۔ یہ الفاظ اس واحد کے لئے بولے
جاتے ہیں جس کے مددگار ہوں اور مددگار یا تو
شریک ہوں گے یا مملوک۔ اس لئے یہ الفاظ متشابہ
ہو گئے، جس کے ساتھ شریک ہوں۔ وہ کہتا ہے
فَعَلنَا نَحنُ کذا (ہم نے ایسا کیا) اور یہ بات
اللہ تعالیٰ کی شان میں ممتنع ہے۔ اور جس کے مددگار
مملوک اور مطیع لوگ ہوں جو اسے بادشاہ سمجھکر اسکی
اطاعت کریں وہ کہتا ہے فَعَلنَا کذا یعنی ہم نے اپنے
اہل ملک اور غلاموں کے ذریعہ یہ کیا اور خدا کے سوا
ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہے وہ

خود جہان کی تدبیر و انتظام کرتا ہے جو کام کرنا چاہے
اور جو کچھ پیدا کرنے کا ارادہ کرے اس کے فرشتے
حکم کی بجاآوری کے لئے مستعد رہتے ہیں وہ اس کے
قاصد اور مطیع ہیں اس اعتبار سے اللہ سبحانہ،
تعالیٰ کو اِنّا اور نَحنُ کہنے کا زیادہ حق ہے کیونکہ
اس کے سوا کسی کی مملکت اور ملکیت مکمل نہیں
اور کسی کا حکم پورے طور پر نہیں مانا جاتا۔

حلول و اتحاد اور تصورِ اوتار کارد

ہندو قوم نے رام اور کرشن کو خدا کا اوتار سمجھ لیا ان کی
دیکھا دیکھی جین دھرم کے پیروؤں نے مہابیر کو اور بدھ
دھرم کے متبعین نے گوتم بدھ کو خدا کا اوتار سمجھ لیا۔
عیسائیوں کا ایک فرقہ یعقوبیہ ہے یہ مسیح بن مریم کو خدا
مانتے ہیں۔ قرآن میں اسی عقیدے کے لوگوں کی طرف
اشارہ ہے۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ
الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ " جو لوگ مسیح بن مریم کو خدا مانتے
ہیں وہ کافر ہیں۔ ایک دوسرا فرقہ ملکانیہ ہے جو مسیح کے
ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) ہونے کا قائل ہے اس آیت میں

انہیں کی طرف اشارہ ہے وَقَالَتِ النَّصَارَى
الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے۔
تیسرا فرقہ نسطوریہ ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ اللہ
تین میں سے ایک ہے لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا
إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ط جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تین
میں سے ایک ہے وہ کافر ہیں،، اس آیت سے اسی
فرقے کی طرف اشارہ ہے۔ عیسائیوں کا کہنا ہے کہ حضرت
عیسیٰ کو سولی دیدی گئی مگر قرآن میں ہے کہ مسیح کو موت
نہیں آئی اور عیسائیوں کا کہنا ہے کہ عیسیٰ کے ناسوت
کو سولی دی گئی لاہوت کو نہیں وہ کہتے ہیں ناسوت
اور لاہوت اس طرح مل گئے جس طرح پانی دودھ میں
مل جاتا ہے یہ تشبیہ یعقوبیہ فرقے کی ہے، یا لاہوت
اور ناسوت اس طرح مل گئے ہیں جس طرح آگ لوہے
مل جاتی ہے۔ تشبیہ ملکانیہ فرقے کی ہے۔ اور ظاہر ہے
کہ اس صورت میں جو چیز پانی کو پہنچے گی وہ دودھ کو
بھی پہونچے گی کیونکہ دونوں چیزیں اس طرح مل گئی
ہیں کہ ایک دوسرے سے ممتاز نہیں رہ گئی ہیں یہی حال
آگ اور لوہے کا ہے جو لوہے میں حلول کر گئی ہے اگر لوہے

کو پیٹا جائے تو آگ بھی متاثر ہوگی اس طرح بدن کو
ضرب لگائی جائے تو ضرب کی تکلیف روح کو بھی
پہنچے گی۔ عیسائیوں نے اتحاد کے ثبوت میں جو تمثیل
پیش کی ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ جو ناسوت کو
پہنچے وہی لاہوت کو بھی پہنچے جیسے حضرت عیسیٰ کو یہود
نے سولی دی ان کے منہ پر تھوکا اس سے ناسوت
اور لاہوت دونوں کو تکلیف پہنچی اتحاد و حلول کے
مسئلے کو تسلیم کرنے پر یہ بات لازمی ہے کیونکہ اتحاد
وہ ہے کہ جو ایک چیز کو پہنچے اس میں دوسری چیز
بھی شریک ہو اگر ایسا نہ ہو تو یہ اتحاد نہیں بلکہ
تعدد ہے۔

عیسائیوں کی یہ کتنی بڑی گمراہی ہے کہ انہوں نے
خالق ارض و سما کو ایک بشر کے ساتھ متحد کر دیا اسے
عورت کے بطن میں پہنچایا اس کے لئے ایک گھر
بنا دیا یہی نہیں بلکہ اللہ کی خبیث مخلوق یہود نے
اسے پکڑا اس کے چہرے پر تھوکا، اس کے سر پر
کانٹے رکھے اور اسے سولی دیدی یہاں ہم عیسائیوں
سے ایک سوال کریں گے کہ یہ بتاؤ کہ لاہوت ان شریر

اور خبیث یہودیوں کو جو حضرت عیسیٰؑ کے قتل کے درپے
تھے ہٹانے پر قادر تھا یا نہیں اگر کہیں کہ قادر نہیں
تھا تو لازم آئے گا کہ وہ شریر یہودی رب العالمین
سے زیادہ قادر تھے، اور رب العالمین شریروں کے
کے سامنے بے بس مقہور و مغلوب تھا یہ تو سب سے
بڑا کفر ہے۔ کہ اس سے اللہ کی ذات میں نقص
لازم آتا ہے۔

اور اگر کہیں کہ قادر تھا تو سوال یہ ہے کہ ناسوت
کی چیخ پکار پر اُس نے اس کی مدد کیوں نہیں
کی۔ جبکہ خود عیسائیوں کا کہنا ہے کہ ناسوت اس
وقت فریاد کر رہا تھا۔ الٰہی الٰہی لِمَ تَرَکْتَنِی،
اے اللہ اے اللہ تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔

استواء علی العرش

اگر کوئی سوال کرے کہ اللہ کہاں ہے تو جواب یہ ہوگا
کہ وہ آسمان میں ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:
ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ ,, کیا تم لوگ اس سے بے خوف
یُّرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا ط ہو گئے ہو جو کہ آسمان میں ہے

کہ وہ تم پہ ایک ہوائے تند بھیج دے۔" اور ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان دعا میں اپنے ہاتھوں کو اوپر اٹھاتے ہیں۔
اسی طرح کسی چھوٹے بڑے سے سوال کریں کہ اللہ کہاں ہے تو وہ انگلی اوپر اٹھا کر کہے گا کہ وہ آسمان میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ آپؐ نے اس لونڈی سے جو آزاد کرنے کے لئے پیش کی گئی تھی سوال فرمایا اَینَ اللّٰہُ (اللہ کہاں ہے) تو اس نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا فِی السَّمَآءِ (آسمان میں) نبی کریمؐ نے فرمایا اس کو آزاد کر دو یہ مومنہ لونڈی ہے۔ اگر فِی السَّمَآءِ (اللہ آسمان میں ہے) کا جملہ صحیح نہ ہوتا تو اللہ کے رسول اس لونڈی کو مومنہ نہ کہتے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ فی السَّمَآءِ کا مطلب فوق السماء (آسمان کے اوپر) ہے کیونکہ فی کا معنیٰ فوق بھی ہوتا ہے جیسے فَسِیحُوا فِی الاَرضِ زمین کے اوپر چلو۔

اور اب آگے کوئی اگر یہ سوال کرے کہ کیف ھو؟ وہ کیسا ہے تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ کیف (کیسے) سے سوال اللہ کی صفت کے متعلق ہے وہ بلند صفات والا ہے

وہ عالم ہے جس کے پاس علم ہے۔ وہ قادر ہے اس کے پاس قدرت ہے۔ وہ زندہ ہے اس کے پاس حیات ہے۔ وہ ہمیشہ ان صفات میں منفرد رہے گا وہ کسی کے مشابہ نہیں رہے گا وہ کسی کے مشابہ نہیں ہوگا نہ کوئی چیز اس کے مشابہ ہوگی۔

اور اگر کوئی سوال اس کی ماہیت کے بارے میں کرے جیسا کہ جہمیہ نے کہا کہ ما ھو؟ تو اس سے یہ کہا جائیگا کہ لفظ ما سے سوال کسی چیز کی صفت یا جنس کے بارے میں ہوتا ہے تو اگر آپ کے سوال سے یہ مراد ہے تو اُس کی صفت علم ہے، قدرت ہے، کلام ہے، عزت ہے، بزرگی ہے۔

اور اگر آپ جنس پوچھ رہے ہیں تو جواب یہ ہے کہ وہ جنس والا نہیں ہے اور اگر (ما ھو) سے آپ یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ اس کی طرف اشارہ کرو تاکہ اس کا حواس کے ذریعے ادراک کریں تو جواب یہ ہوگا کہ انسان جو کچھ ادراک کر سکتا ہے حواس کے توسط سے کر سکتا ہے لیکن خدا محسوسات کے کے دائرے سے باہر ہے اس کے لئے ادراک کا کوئی ذریعہ

اگر (ما ھو) سے آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اسکی حکمت کے آثار اور اسکی صنعت کے عجائب بتلاؤ تو وہ چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں ۔ اور اگر ماھو سے یہ پوچھنا مقصود ہے کہ اس کا نام کیا ہے تو جواب یہ ہے کہ ھو اللّٰہُ (وہ اللہ ہے)

اگر سوال کیا جائے کہ وہ پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھا تو جواب یہ ہے کہ لفظ (اَیْنَ کہاں) یہ مکان (جگہ) کا تقاضا کرتا ہے اور تمام جگہیں مخلوقات ہیں اور سبحانہ تعالیٰ پیدائش اور جگہوں اور مکانوں سے قبل بھی تھا۔ لیکن نہ کسی مکان میں اور نہ کسی زمان میں ۔

ھو الاول وَ الاخر ۔ اول کا مطلب ہے لیس قبلہ شیءٍ اس کے پہلے کچھ نہیں تھا ۔ آخر کا مطلب لیس بعدہ شیءٍ اس کے بعد بھی کچھ نہیں ہوگا ۔

اور اگر یہ سوال ہو کہ اس وقت وہ کہاں ہے تو جواب یہ ہوگا وہ عرش پر مستوی ہے : اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی ۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ عرش کا محتاج ہے کہ اگر عرش اس کے نیچے نہ ہے تو وہ گر جائے تو جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش تو کیا ساری چیزوں سے بے نیاز ہے

وہ اپنی قدرت سے عرش اور عرش کو اٹھانے والے فرشتوں کو سنبھالے ہوئے ہے ۔ روایت ہے کہ حاملین عرش کو عرش اٹھانے کی طاقت اس وقت ہو سکتی ہے جب اللہ انہیں لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہنے کا حکم دیتا ہے ۔

امام مالک سے کسی نے پوچھا کہ اللہ عرش پر کیسے مستوی ہے تو تھوڑی دیر آپ نے سر جھکایا اور فرمایا : استواء غیر مجہول والکیف غیر معقول والایمان بہ واجب والسوال عنہ بدعۃ : ۔ استواء معلوم ہے اور کیفیت نامعلوم ہے اور ایمان اس پر واجب ہے اور اس سلسلے میں سوال کرنا بدعت ہے اور آپ نے سائل سے فرمایا کہ مجھے تو گمراہ دکھائی دیتا ہے ۔

اب سوال یہ ہے کہ عرش کہاں ہے ؟ تو صحیحین میں ایک روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم اللہ سے مانگو تو جنت الفردوس مانگو کیونکہ وہ جنت کا اعلیٰ درجہ ہے اور اس کی چھت اللہ کا عرش ہے ۔ اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ عرش تمام مخلوقات سے اوپر ہے ۔

اب رہا یہ سوال کہ اللہ آتا ہے اللہ اترتا ہے تو اگر اس
کے لئے نزول ہے تو لازم آئے گا کہ عرش اس سے
خالی ہو جائے، دوسرے یہ لازم آئے گا کہ عرش اوپر
ہو جائے اور اللہ (نعوذ باللہ) نیچے ہو جائے۔

تو ائمہ سلف مکحول، زھری، اوزاعی، ابن مبارک،
سفیان ثوری۔ لیث بن سعد، مالک بن انس، شافعی
احمد، وغیرھم نے احادیث نزول وغیرہ کے بارے میں
بالاتفاق یہ فرمایا ہے کہ سلامتی کا راستہ یہ ہے کہ
اعتقاد رکھا جائے کہ اس کا علم اللہ ہی کو ہے اور
اللہ ہی اسکی تاویل جانتا ہے۔ اس پر اگر یہ اعتراض
کیا جائے کہ اس پر ایمان لانا کیسے صحیح ہوگا جس کی
حقیقت کا علم ہمیں نہ ہو۔؟

جواب یہ ہے کہ جس طرح اللہ پر ملائکہ پر اور کتابوں،
رسولوں، یوم آخرت جنت، جہنم پر ایمان لائے ہیں
اسی طرح اس پر بھی ایمان لائیں گے۔ اور ہمیں معلوم
ہے کہ ان سب کا تفصیلی علم ہمیں نہیں ہے۔ کہا یہ جائے
گا کہ وہ اترتا ہے اور اس کا یہ اترنا اس کے جلال کے
مطابق ہے۔

رُویتِ باری

حدیث میں ہے کہ تم اپنے رب کو قیامت کے دن اس
طرح دیکھو گے جس طرح شمس و قمر کو دیکھتے ہو تمہارے
ساتھ رویت باری میں بخل نہیں کیا جائے گا۔ اس
حدیث سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن اللہ کا دیدار
ہوگا۔ قرآن میں ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ
آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں آیت کریمہ میں
ادراک کی نفی ہے مگر رویت کا اثبات کرتی ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ رویت باری ہوگی ادراک باری نہیں
ہو سکتا کیونکہ ادراک کا مطلب ہے چیز کا مکمل احاطہ
کر لینا۔ ابن عباس یا عکرمہ نے اس آدمی سے جس نے
اس آیت کے ذریعہ معارضہ کیا تھا فرمایا تھا کہ کیا تو
آسمان دیکھتا ہے اس نے کہا کیوں نہیں؟ پوچھا پورا
آسمان دیکھ رہے ہو تو چپ ہو گیا، منکرین رویت باری
یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر رویت باری کو ممکن
تسلیم کر لیا جائے تو اللہ کا کسی جہت میں ہونا لازم آئیگا
تو جواب یہ ہے کہ رویت اور معائنہ کے لئے مرئی کا کسی

جہت میں ہونا ضروری نہیں ہے ۔ مثلاً چراغ جلانے
کے بعد ہمیں چراغ کی لو دکھائی دیتی ہے جبکہ چراغ
کی لو کسی جہت میں نہیں ہے ۔ اسی طرح جب حضرت
موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر گئے اور انہوں نے اللہ
تعالیٰ کی آواز سنی تو کہہ بیٹھے رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ
اِلَیْكَ ط اے میرے رب تو مجھے دکھا میں تجھے دیکھنا
چاہتا ہوں تو جواب ملا کہ تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے یعنی
دنیا کی فانی آنکھیں میرے دیدار کی متحمل نہیں ہو سکتیں
اس کا مطلب یہ نہیں کہ رویت باری ممتنع اور محال ہے
ورنہ لازم آئے گا کہ حضرت موسیٰ نے امر محال کا مطالبہ
اللہ سے کیا جو سفاہت ہے اور نبی سے سفاہت کا
صدور ناممکن ہے ۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے : قَالَ
یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ
ہود نے کہا اے میری قوم سفیہ یعنی بیوقوف نہیں ہوں ۔
صحیح بخاری میں ابو سعید خدری کی یہ حدیث مروی ہے کہ میں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے
کہ ہمارا رب اپنی پنڈلی کھول دے گا تو ہر مومن مرد اور
ہر عورت سجدے میں گر پڑیں گے ہاں جو لوگ دکھانے سنانے

کے لئے سجدے کیا کرتے تھے وہ سجدہ کرنا چاہیں گے لیکن
ان کی کمر تختہ ہو جائے گی ۔ (یعنی وہ سجدہ نہ کر سکیں گے)

توحید اور شرک

توحید کی ضد شرک ہے جس طرح توحید پر جنت کا
وعدہ ہے اسی طرح شرک پر ہمیشہ کے لئے جہنم کی وعید
ہے ۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ خالص توحید ہی دین فطرت
ہے توحید پر شرک کا غبار آہستہ آہستہ جمتا ہے مگر
توحید کا ذرا سا چمکارا شرک کی ظلمت پر غالب آجاتا ہے
جس سے بدیہی طور پر یہی نکلتا ہے کہ فطرت انسانی
کو توحید سے مناسبت ہے ورنہ وہ کیوں اس کی طرف
تیزی سے دوڑتا ہے اور دوسری طرف آہستہ آہستہ کھسکتا
ہے یہ تو معلوم ہو گیا کہ توحید داخل فطرت ہے تاہم
یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شرک کہاں سے آتا ہے اگر
جزو فطرت نہیں تو یہ بیماری کثیر الوقوع کیوں ہے اسکے
لئے تفصیل میں جانے کے بجائے بطور اصل الاصول
کے یہ جاننا کافی ہے کہ شرک کے دو سبب ہیں ۔ غفلت
اور دنائت ، پہلا سبب عقلی ہے اور دوسرا اخلاقی اور یہ دونوں

عدمی ہیں کیونکہ غفلت اسی کا نام ہے کہ انسان خدا کی بخشی ہوئی عقل سے جو بہترین عطیۂ فطرت ہے کام نہ لے۔ عقائد میں اوہام باطلہ اور اعمال میں فوائد عاجلہ کی پیروی کرے۔ اور دنائت یہ ہے کہ اللہ نے اسے اشرف المخلوقات بنایا اور وہ مخلوق یعنی شجر و حجر اور دیگر چیزوں کی بندگی کرنے لگ جائے۔

قرآن معلم التوحید ہے

آریوں نے اپنی ناسمجھی سے یہ اعتراض کیا تھا کہ قرآن میں شرک کی تعلیم ہے جیسا کہ قرآن کے پہلے پارہ میں ہے کہ اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں تمام ملائکہ نے آدم کو سجدہ کیا۔ طرفہ یہ کہ شیطان بوجہ توحید کے جو اس کو پہلے سے تعلیم ہوئی تھی سجدہ نہیں کیا تو اس کو مردود گردانا۔ سوال یہ ہے کہ آدم کا سجدہ عبودیت کا تھا یا کچھ اور۔ اگر عبودیت کا تھا تو بے شک قرآن معلم الشرک ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ یہ سجدہ جو فرشتوں سے کروایا گیا سجدۂ تعظیمی تھا سجدۂ عبادت ہوتا تو شیطان اپنی معذوری اور جواب دہی

میں خَلَقْتَنِی مِن نَّارٍ وَّ خَلَقْتَہٗ مِن طِینٍ ط (میں آدم سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے پیدا کیا) نہ کہتا بلکہ صاف صاف اللہ سے یہ کہتا کہ جناب والا یہ کیا انصاف ہے کہ ہمیں ایک طرف تو شرک سے روکا جاتا ہے اور دوسری طرف شرک کی تعلیم دی جاتی ہے کیونکہ شیطان تو بہت ہوشیار ہے، اسے یہ عذر ضرور ہی سوجھنا چاہئے تھا معلوم ہوا کہ یہ سجدہ سجدۂ عبادت نہ تھا بلکہ محض اس معنیٰ میں تھا جیسے کسی سردار یا نواب و بادشاہ کو ماتحت لوگ ایک خاص وقت میں حاضر ہو کر سلام کیا کرتے ہیں جس میں اس سردار و بادشاہ کی رفعت اور ماتحتوں کی وفاداری کا ثبوت ہوتا ہے جو شیطان کو پسند نہ آیا۔

"لیس کمثلہ شیءٌ"

(اس کے مثل کوئی چیز نہیں)

مذکورہ بالا آیت کریمہ کے ٹکڑے میں کسی نحو پڑھنے والے طالب علم کو شبہہ ہوسکتا ہے کہ "کمثلہ" میں "کاف" حرف جار ہے جو تشبیہ کے لئے آتا ہے جیسے زید

کالاسد (زید شیر کی طرح ہے) تو آیت کریمہ کے اس
ٹکڑے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے مثل کی طرح کوئی
چیز نہیں اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ "کاف" حرف جار کبھی
تشبیہ کے لئے آتا ہے جیسا کہ مذکورہ مثال میں ہے کبھی
تعلیل کے لئے آتا ہے جیسے اذکروا اللہ کما ھدٰکم
اللہ کو یاد کرو اس لئے کہ اس نے تم کو ہدایت کی۔ اسی طرح
کبھی تاکید کے لئے آتا ہے اس صورت میں یہ "ک"
زائد ہوتا ہے۔ سورہ اخلاص کی چوتھی اور آخری
آیت میں جو لفظ کُفُوًا استعمال کیا گیا ہے اس کے
معنی ہیں نظیر، مشابہ، مماثل، مساوی، ہم رتبہ، اس
آخری آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ساری کائنات میں کوئی
نہ کبھی تھا نہ کبھی ہو سکتا ہے، جو اس کی ذات، صفات
افعال، اختیارات میں اس سے مشابہت اور مماثلت
رکھتا ہو۔ شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے۔ ع

دار فانی کی کوئی چیز نہیں
ہستیٔ لایزال کی صورت

مشابہت اور مماثلت میں فرق ہے (۱) دو چیزیں ایک
فرع میں شریک ہوں تو وہ مماثلت ہے۔ جیسے زید، عمر،

انسانیت میں۔
(۲) دو چیزوں کا اشتراک اگر وصف لازم ہو تو مشابہت
ہے جیسے خالد اور شیر شجاعت میں۔ اسی طرح تشبیہ
اور تمثیل میں بڑا فرق ہے، تشبیہ میں اصلی نگاہ مشبہ
اور مشبہ بہ پر ہوتی ہے۔ اور دونوں کے اجزاء کو ایک
دوسرے کے مقابل میں رکھکر دیکھا جاتا ہے کہ ان میں
باہم دگر کتنی مطابقت پائی جاتی ہے پھر اسی مطابقت کے
لحاظ سے اس سے تشبیہ کا حسن و قبح متعین ہوتا ہے۔
لیکن تمثیل میں اجزا کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی بلکہ
اس میں ایک صورتِ واقعہ کو دوسری صورت واقعہ
سے تشبیہ دی جاتی ہے ایک صورت حال اور دوسری
صورت حال میں پوری پوری مطابقت موجود ہے تو تمثیل
مکمل ہے اگرچہ تشبیہ کے وہ تمام ضوابط اس پر منطبق
نہ ہو رہے ہوں جو ایک تشبیہ کے مکمل ہونے کے لئے
ضروری ہیں۔

مولانا عبدالمبین منظر رحمہ اللہ کے طالب علمی کا ایک واقعہ
بیان کیا جاتا ہے کہ دھلی کمپنی باغ میں طلبہ کچھ دینی
مسائل پر بحث کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک آدمی آیا اور

بولا کہ آپ لوگ خدا کا کلام قدیم مانتے ہو اور یہ بھی مانتے ہو کہ ایک وقت ایسا بھی گذرا ہے کہ اللہ موجود تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی؟ سب طلبہ نے اس کا جواب اثبات میں دیا تو اس نے کہا کہ تمھارا اللہ فرماتا ہے کہ لیس کمثلہ شیئ (اس کے مثل کوئی چیز نہیں) تو سوال یہ ہے کہ مخلوق کے وجود میں آنے سے پہلے جب خدا کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی تو اس نے کس کے مقابلے کہا کہ میرے مثل کوئی چیز نہیں۔ مثالی مقابلہ تو اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ سامنے دوسری چیز موجود ہو، اس اعتراض سے اس آریہ کا مقصد یہ تھا کہ آریوں کا عقیدہ روح اور مادہ کے قدیم ہونے کا صحیح ہے۔ اور مسلمانوں کا عقیدہ کہ مخلوق کی پیدائش سے پہلے خالق کے سوا کوئی چیز نہ تھی غلط ہے۔ تمام طلبہ اس سوال کے جواب میں حیران رہے کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ بتاتا مگر جواب فٹ نہ ہوتا۔ مولانا عبدالمبین منظر رح جو اس وقت طالب علم تھے اور وہاں موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ اس کا جواب میں دیتا ہوں تمھارے نزدیک یہ مسلم ہے کہ اللہ اس ذات واجب الوجود کو کہتے ہیں جو تمام صفات کمالیہ کا

جامع ہو ورنہ نقص لازم آئے گا۔ پس اس کی صفت کمال میں سے یہ بھی ہے کہ جو چیز ابھی وجود میں نہیں آئی اسے بھی موجود کی طرح دیکھے جیسے ہم اپنا گھر جو یہاں موجود نہیں دل کے آئینے میں دیکھ رہے ہیں اس کے علاوہ خالق بہرحال اپنی مخلوق سے افضل اور بے مثل ہوگا۔ پس ہر صورت میں مثلیت باطل اور بس لیس کمثلہ شیئ کا معاملہ صحیح ہوگا یہ جواب سنکر آریہ متحیر ہوگیا اور اس سے کوئی بات نہ بن آئی

امکان کذب باری محال ہے

اگر کوئی شخص امکان کذب باری کے ثبوت میں دلیل پیش کرتے ہوئے یوں کہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ یعنی بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے" اور جھوٹ بولنا بھی ایک شیٔ ہے لہٰذا اللہ جھوٹ بولنے پر قادر ہے اور جب وہ جھوٹ بولنے پر قادر ہے تو جھوٹ بولنا اس کے لئے ممکن ہوا جس سے ثابت ہوا کہ مسئلہ امکان کذب الٰہی حق ہے۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا جھوٹ بولنا محال ہے۔ اس کو ہم برہان قطعی سے ثابت کر رہے ہیں۔ برہان علم منطق میں اس قیاس کو کہتے ہیں جو صرف مقدمات یقینیہ سے مرکب ہو خواہ سب مقدمات بدیہی ہوں یا سب نظری یا بعض بدیہی ہوں اور بعض نظری۔ یوں ہی سب عقلی ہوں یا سب نقلی یا بعض عقلی اور بعض نقلی۔
قیاس کی صورت یوں ہو گی۔
جھوٹ بولنا عیب ہے (صغریٰ) اور ہر عیب اللہ تعالیٰ پر

محال بالذات ہے (کبریٰ)۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ جھوٹ بولنا اللہ پر محال بالذات ہے۔ مذکورہ مثال میں مقدمہ اولیٰ یعنی صغریٰ عقلی بدیہی ہے اور مقدمہ ثانیہ یعنی کبریٰ عقلی نظری ہے۔

برہان قطعی سے یہ ثابت ہو چکا کہ اللہ کا جھوٹ بولنا محال ہے۔ اب دوسرے قیاس کی صورت یوں ہو گی۔
اللہ کا جھوٹ بولنا محال ہے (صغریٰ) اور کوئی محال زیر قدرت نہیں (کبریٰ) نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کا جھوٹ بولنا زیر قدرت نہیں۔

اور جب اللہ تعالیٰ کا جھوٹ بولنا زیر قدرت نہیں تو اس کا جھوٹ بولنا ممکن نہیں اور جب ممکن نہیں تو ثابت ہو گیا کہ مسئلہ امکان کذب باری باطل محض ہے۔

شرح عقائد جلالی میں ہے: الکذب نقص والنقص علیہ محال فلا یکون من الممکنات ولا تشملہ القدرۃ، یعنی جھوٹ بولنا عیب ہے اور عیب اللہ تعالیٰ پر محال ہے لہٰذا جھوٹ بولنا ممکن نہیں اور نہ وہ زیر قدرت ہے۔

شرح مواقف میں ہے: لانہا تختص بالممکنات

دون الواجبات والممتنعات یعنی قدرت الٰہیہ ،
صرف ممکنات سے متعلق ہے ، واجبات اور محالات
سے نہیں اور جب ثابت ہوگیا کہ زیر قدرت صرف
ممکنات ہیں تو آیت کریمہ اِنَّ اللّٰہَ علیٰ کلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ
میں " کل شیء " ، سے مراد کل ممکن ہے جس کا معنیٰ یہ ہوا
کہ ہر ممکن زیر قدرت الٰہی ہے اور چونکہ اللہ کا جھوٹ
بولنا ممکن نہیں اس لئے وہ اس کل شیء میں داخل
نہیں رہا آیت مقدسہ وھو بکل شیء علیم کا ارشاد
تو اس میں کل شیء سے مراد کل مفہوم ہے لہٰذا
اس کل شیء میں واجب ، ممکن ، محال ، قدیم ، حادث ،
کلی ، جزئی ، موجود ، معدوم ، مفروض ، موہوم سب
داخل ہیں ۔ کیونکہ جہانتک علم الٰہی کی بات ہے وہ ممکن
واجب ، محال وغیرہ سب کو شامل ہے ۔

جیسا کہ شرح مواقف میں ہے ۔

علمہ تعالیٰ یعم المفہومات کلھا الممکنۃ
والواجبۃ والممتنعۃ فھو اعم من القدرۃ

یعنی علم الٰہی ممکن ، واجب ، محال ، سب کو شامل ہے علم
الٰہی قدرت الٰہیہ سے عام ہے ۔

واضح ہو کہ مناطقہ مفہوم کی تین قسمیں کرتے ہیں
واجب ، ممکن ، محال ۔

واجب[1] : وہ ہے جس کا وجود ضروری ہو جیسے
ذات باری ۔

ممکن : وہ ہے جس کا نہ وجود ضروری ہو نہ عدم
جیسے تمام مخلوقات ۔

محال : وہ ہے جس کا عدم ضروری ہو یعنی جو
وجود کو قبول نہ کرسکے جیسے شریک باری تعالےٰ

---

[1] جاننا چاہیئے کہ واجب یہ اللہ کے اسماء حسنیٰ
میں سے کوئی اسم نہیں یہ مناطقہ کا گھڑا ہوا لفظ ہے اسی
طرح قدیم وحادث اصطلاح بھی انہیں کی اختراع ہے

جلال الدین قاسمی

معطلہ اور مشبہہ کا رد

معطلہ جو امت کا ایک گمراہ فرقہ ہے وہ ذات باری سے تمام صفات کی نفی کرتا ہے ہم ان سے یہ سوال کریں گے کہ صفات کے انکار سے یہ لازم آتا ہے کہ کہ اللہ سے وجود کی بھی نفی کر دی جائے کیونکہ وجود بھی تو ایک صفت ہے۔ اور اگر آپ ذات باری کو وجود کی صفت سے متصف مانتے ہیں تو دیگر صفات سے انکار کیوں؟

آریوں کا بھی یہی حال تھا جب ان سے توحید کے سلسلے میں گفتگو ہوتی تو فوراً یہ کہتے کہ خدا بھی موجود ہے اور ہم بھی موجود ہیں یہ تو شرک ہو گیا جس کا جواب مولانا ثناء اللہ صاحب امرت سری رحمہ اللہ نے یہ دیا تھا کہ خدا جس معنیٰ میں موجود ہے اس معنیٰ میں کوئی موجود نہیں اگر کوئی مسلمان اس معنیٰ میں کسی نبی یا رسول کو موجود مانے گا تو مشرک ہو جائے گا۔

خدائے تعالیٰ تو اپنے اصلی اور حقیقی وجود سے اور کائنات کی دوسری چیزیں اس کی ایجاد سے موجود ہیں

اور صرف اتنے ہی وقت تک موجود ہیں جب تک وہ ہم کو موجود رکھے۔ اس لئے ہماری مثال بالکل ٹرین کے ڈبوں اور انجن کی سی ہے۔ انجن حرکت سے متصف ہے اور ڈبے بھی حرکت سے متصف ہیں مگر عقلمند ان دونوں حرکتوں میں تمیز کر سکتا ہے کہ انجن کی حرکت اور ہے اور ڈبوں کی حرکت اور۔ انجن کی حرکت حقیقی اور اصلی ہے اور ڈبوں کی حرکت طفیلی۔ دونوں حرکتوں کو یکساں کہنا کسی عقلمند کا کام نہیں۔ ٹھیک اسی طرح اللہ موجود ہے بغیر کسی ایجاد کے۔ اور ہم موجود ہیں اللہ کی ایجاد سے۔

وجود باری پر بحث

قدماء اللہ کے وجود پر اس طرح استدلال کرتے ہیں۔

العالم متغیر و کل متغیر حادث فالعالم حادث. کہ عالم تغیر پذیر ہے اور ہر وہ چیز جو تغیر کو قبول کرے اور تبدیلی کا محل بنے وہ حادث اور مخلوق ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عالم حادث و مخلوق ہے اور ہر مخلوق کے لئے کسی خالق کا ہونا ضروری ہے اور اسی کو ہم اللہ کہتے ہیں۔ اس استدلال پر ایک اعتراض ہوتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ عالم کی تمام چیزیں دو چیزوں کا مجموعہ ہیں مادہ[1]، صورت[2] تغیر پذیر صرف صورت ہے اصل مادہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ عالم کو حادث ماننا صورت کے اعتبار سے تو صحیح ہے مگر مادے کے اعتبار سے حادث ماننا صحیح نہیں ہے۔ ارسطو نے اسی اعتراض سے بچنے کے لئے استدلال کا دوسرا طریقہ اختیار کیا وہ یوں استدلال کرتا ہے کہ عالم کے تمام اجزاء متحرک ہیں کیونکہ اجسام گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں اور جو شیء متحرک ہو ضرور ہے کہ اس کے لئے کوئی محرک ہو۔

بوعلی سینا کہتا ہے کہ عالم قدیم بھی ہے اور خدا کا مخلوق

بھی، اس پر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ جب عالم اور خدا دونوں قدیم اور ازلی ہیں تو ایک کو علت اور دوسرے کو معلول کیسے کہا جا سکتا ہے کیونکہ علت اور معلول میں زمانہ کا تقدم اور تاخر ضروری ہے۔ جس کا جواب بوعلی سینا نے یوں دیا کہ علت کے لئے تقدم بالذات کافی ہے تقدم زمانی ضروری نہیں مثلاً کنجی کی حرکت تالے کے کھل جانے کی علت ہے لیکن کنجی کی حرکت اور تالے کے کھل جانے میں ایک لحظے کا بھی آگا پیچھا نہیں۔

اس دلیل سے ایک علۃ العلل (cause of The causes) کا وجود تو ثابت ہو جاتا ہے لیکن علت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس سے معلول بہ ارادہ اور بہ اختیار صادر ہو۔ مثلاً "آفتاب" روشنی کی علت ہے لیکن آفتاب کو نہ علم ہے نہ ارادہ ہے بلکہ روشنی اس سے بلا علم و ارادہ صادر ہو رہی ہے۔

ملاحدہ اور مادیین کہتے ہیں کہ مادہ خود بخود پیدا ہوا مادہ کے ساتھ حرکت پیدا ہوئی، حرکت نے امتزاج پیدا کیا پھر رفتہ رفتہ قوانین قدرت پیدا ہو گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کا وجود وہمی اور خیالی ہے اس کے وجود کا

عقیدہ رکھنا سراسر حماقت ہے لیکن ہم یہ سوال کرینگے کہ کائنات میں سیکڑوں لاکھوں قوانین قدرت ہیں ان میں توافق اور تناسب کہاں سے آیا، توافق اور اتحاد خود ان قوانین کی ذاتی خاصیت نہیں ہے اگر کوئی ایسا دعوی کرے تو یہ ایک فرضی احتمال ہوگا جس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کمزور سے کمزور گھاس اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جبتک خاک، ہوا پانی، سے لیکر آفتاب و ماہتاب کے افعال و خواص اس کے پیدا کرنے میں مشارکت اور توافق کو عمل میں نہ لائیں اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جس طرح انسان کے اعضاء وجوارح الگ الگ ہیں اور ہر ایک کا کام جدا جدا ہے لیکن کوئی عضو اس وقت تک کام نہیں کرسکتا جبتک تمام اعضاء بالذات یا بواسطہ اس کے عمل میں شریک نہ ہوں یا کم از کم اس عضو کے عمل میں کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔

خلاصہ سورہ اخلاص

(۱) اللہ کے وجود کے منکر کا ابطال لفظ "ھو" سے کیا گیا ہے۔ یہ لفظ ذات پر دلالت کرتا ہے یعنی وہ ہستی جسے قرآن "اللہ" سے تعبیر کرتا ہے فی الحقیقت موجود ہے اس کا وجود وہمی و خیالی نہیں ہے

(۲) اللہ کی ذات کے اول ہوتے کے منکر کا ابطال لفظ "اللہ" سے کیا گیا ہے کیونکہ اللہ کا لفظ قرآن میں صرف اسی ہستی پر بولا جاتا ہے جو رب العالمین ہے یعنی ساری کائنات کا خالق، رازق، منتظم، مالک اور ہر شیٔ کو مرتبۂ کمال تک پہنچانے والا ہے اس سے ثابت ہوا کہ ساری کائنات مخلوق ہے اور اللہ اس کا تنہا خالق ہے۔

(۳) منکر توحید کا ابطال "احد" سے کیا گیا ہے یعنی اللہ ایسا "ایک" ہے کہ اس جیسا دوسرا نہیں ہے یعنی یکتا لا نظیر لہ ولا مثیل لہ و لا شریک لہ ہے۔

(۴) مشرک فی الصفات، مشرک فی العبادات، مشرک فی الاستعانۃ اور مشرک فی الحکم ان چاروں گروہوں کا ابطال لفظ "صمد" سے کیا گیا ہے۔

(۵) قائلین ابنیت (اللہ کے بیٹا یا بیٹی ہے) کا ابطال "لم یلد" سے کیا گیا ہے۔

(۶) معتقدین الوہیت (فلاں شخص اوتار ہے جیسے ہندو رام کرشن وغیرہ کو اوتار مانتے ہیں) کا ابطال "ولم یولد" سے کیا گیا ہے

(۷) معتقدین مماثلت (فلاں شخص یا ہستی بھی خدا ہے یا اس کی ہمسر ہے)

کا ابطال "وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ" سے کیا گیا ہے۔

قارئین کرام خوب غور سے دیکھ لیں انکار یا

شرک کی یہی مذکورہ بالا صورتیں ہیں جو نزول قرآن کے وقت دنیا میں پائی جاتی تھیں کتاب اللہ کی اس مختصر سورہ کا اعجاز غور طلب ہے کہ دو سطروں میں سارے جہاں کے عقائد باطلہ کا رد کر دیا ہے۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ

WWW.ISLAMICLECTURES.WAPKA.MOBI
KI SHAANDAR PESHKASH

علم کے شائقین متوجہ ہوں

(۱) اسلام میں عورت کا مقام

(۲) اسلام سے پہلے عورت کا حال زار

(۳) اسلام میں چار شادیوں کی اجازت کیوں

(۴) صرف چار ہی عورتوں پر انحصار کیوں پانچ یا چھ پر کیوں نہیں۔

(۵) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے چار سے زائد بیویوں کی اجازت کیوں

(۶) فیملی پلاننگ اور عزل میں فرق

(۷) کیا عورت مانع حمل دوائیں استعمال کرسکتی ہے اور لوپ وغیرہ بٹھوا سکتی ہے یا نہیں۔

(۸) عورت کا پردہ کہاں سے کہاں تک ہے؟

(۹) مرد عورت کے قوام کیوں؟

ان جیسے بہت سے اہم اور اُلجھے ہوئے سوالات کا حل معلوم کرنے کیلئے مولینا جلال الدین صاحب قاسمی کے نوک قلم سے نکلنے والی روشن تحریر "عورت اور اسلام" نامی کتاب میں ملاحظہ فرمائیں اپنے موضوع پر منفرد کتاب، سطر سطر فکر انگیز۔